مکتوب کینیڈا

میرے عالمی اُردو کالموں پر مشتمل مضامین
(اور انسانی حقوق برائے جمّوں و کشمیر کے لئے سرگرمیاں)

راجہ محمد حبیب جالب
چیئرمین جمّوں اینڈ کشمیر ہیومین رائٹس کونسل انٹرنیشنل وِنگ
صدر: انسانی حقوق وِنگ کشمیر سولیڈریٹی کونسل، نارتھ امریکہ

مکتوب کینیڈا

میرے عالمی اُردو کالموں پر مشتمل مضامین
(اور انسانی حقوق برائے جمّوں و کشمیر کے لئے سرگرمیاں)

راجہ محمد حبیب جالب
چیئرمین جمّوں اینڈ کشمیر ہیومین رائٹس کونسل انٹرنیشنل وِنگ
صدر: انسانی حقوق وِنگ کشمیر سولیڈریٹی، کونسل، نارتھ امریکہ

☆☆☆

وقت کتنی تیزی سے گذرتا ہے، اس کا احساس آج مجھے ہو رہا ہے۔ گو مجھے اپنی زندگی سے کوئی شکائیت نہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں دنیا کے کئی ممالک کی سیر کی۔ ہزاروں افراد سے ملاقات ہوئی۔ جو اعلیٰ پایہ کے فلاسفر اور انتہائی ذہین افراد میں شمار ہوتے تھے۔۔ مجھے اپنی بچپن کی یادوں میں پونچھ کے خطّہ با کے انتہائی دور دراز علاقے میں اس جگہ کی یاد آتی ہے، جسے بن بہک کہا جاتا تھا۔ یہ چھوٹا سا علاقہ ہمارے خاندان کی زمینوں پر مشتمل تھا۔ پہلے میرے والد، میرے تایا جان اور چچا جان ایک ہی گھر میں رہتے تھے۔ مجھے بچپن کا وہ دور یاد ہے جب انتہائی اونچی پہاڑی نانگا پیر کے دامن میں ہمارے مکانات تھے۔ میرے والد پاکستان میں ملازمت کرتے تھے۔ میرے چچا جو پرچون فروش تھے، گھر سے ہی دوکان کا کام کرتے تھے۔ لوگ ان سے کھانے پینے کی اشیاء خریدتے۔ غربت کا یہ عالم تھا کہ کسی کے پاس چند روپے تک نہیں ہوتے تھے، اکثر لوگ گھر سے مکئی یا گندم کا کچھ سامان لے آتے اور بدلے میں چینی اور چائے خریدتے۔ جس گھر میں چائے ہو وہ گھر خوش قسمت گردانا جاتا تھا۔ لوگ سادگی سے زندگی گذارتے۔ جھگڑے، فسادات بہت کم ہوتے تھے۔ میرے چچا ١٩٤٧ء میں ڈوگروں کے ساتھ تصادم میں زخمی ہوگئے تھے۔ اسلئے وہ باہر کام کیلئے جانے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ گھر میں تینوں بھائی انتہائی ماہر نشانہ باز تھے اور ہمارے گھر میں بندوقوں کی کمی نہ تھی۔ لوگ ہمارے گھروں کے پاس آنے سے ڈرتے تھے۔ کیونکہ انہیں علم تھا کہ میرے چچا جان بندوق چلانے سے دریغ نہیں کریں گے۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میری والدہ انتہائی خوبصورت خاتون تھیں۔ سرخ بال، نیلی آنکھیں اور سرخ و سفید چہرہ، سادے کپڑوں میں بھی جنت کی حور سے کم نہ تھیں۔ انتہائی سادہ طبیعت کی تھیں۔ وہ اکثر مجھے اپنی بڑی بہن کے ساتھ چھوڑ کر چلی جاتی تھیں۔ میری فاطمہ بہن کئی دفعہ میری ٹانگیں چارپائی کے ساتھ چادر لپیٹ کر باندھ دیتی تاکہ میں گھر سے باہر نہ نکل جاؤں۔ انہیں خطرہ تھا کہ میں باہر نکل گیا تو کہیں پہاڑی سے گر نہ جاؤں۔ کیونکہ میرے مکان کے ساتھ ہی فاصلے پر خطرناک جگہ تھی۔ ایک دن میری والدہ نے دیکھا تو حیران رہ گئی کہ میری ٹانگ کس طرح باندھی گئی ہے۔ فوراً کھولا، گلے سے لگایا اور روتی رہیں۔ میں اپنے ہاتھوں سے اسکے آنسو صاف کرتے ہوئے خود بھی رونے لگا۔ بہن باہر سے آئیں تو انہوں نے صفائی پیش کی۔ میری والدہ صاحبہ سادہ طبیعت کی تھیں۔ خاموش ہوگئیں اور یوں میری بڑی بہن سزا سے بچ گئیں۔ بن بہک کا یہ علاقہ گاؤں جھڑ غنی آباد سے دور تھا۔ سامنے بھٹی کا گاؤں تھا۔ وہ لوگ انتہائی شریف مگر سخت طبیعت کے لوگ تھے۔ کسی کے ساتھ زیادتی نہ کرتے مگر کوئی غلط کام کرے تو کبھی معاف نہ کرتے تھے۔

اکثر میری والدہ روتی تھیں اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی تھیں کہ کب موسم گرما ختم ہو اور وہ گاؤں واپس جائیں۔ جب فصل کاٹی جاتی تو مکئی کی فصل کو مکانوں کے اوپر چادریں بچھا کر دانوں کو دھوپ میں رکھا جاتا اور تین دن کے بعد انکو بوریوں میں بھر کر رکھا جاتا۔ اس وقت ہم سب جان چکے تھے کہ ہمارا گاؤں میں دوبارہ روانگی کا وقت آگیا ہے۔ کیونکہ دسمبر کے بعد تو یہ علاقے زبردست برف باری کے بعد دوسرے علاقوں سے کٹ جاتے تھے۔ اور یوں جب ہم گاؤں روانہ ہوتے تو ہم خوش ہوتے۔

مال مویشی کا راستہ مختلف تھا اور اشیاءِ خورد و نوش اور دوسرا گھریلو سامان لے جانے کیلئے رشتہ دار اور مزدور آ جاتے۔ اور یوں شام کو جب ہم پہنچ جاتے تو سب لوگوں کو کھانے کے بعد گھروں میں بھیجا جاتا۔ میں گھر کے باہر کھڑا ہو کر آنے جانے والوں کو دیکھتا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ جس دن مجھے سکول کیلئے تیار کیا گیا۔ صبح سویرے میری والدہ نے باہر کے کمرے میں مجھے غسل کروایا۔ پانی اسقدر ٹھنڈا تھا کہ ایسے لگ رہا تھا کہ کسی نے مجھے ننگے بدن برف میں ڈال دیا ہے۔ میری والدہ کو اس بات کا علم ہی نہیں تھا کہ پانی ٹھنڈا ہے۔ جب کپڑے پہن کر میں اندر آیا تو سردی سے پورا جسم حرکت میں تھا اور میری چچی صاحبہ نے میری والدہ صاحبہ کو کہا کہ یہ کیا کر دیا۔ بچہ بیمار ہو جائیگا۔ اس پر میری والدہ صاحبہ نے اتنی بات کی۔ مجھے نہیں معلوم بچوں کو غسل کیسے کرنا چاہیئے۔ خیر مجھے یاد ہے کہ مجھے چائے پلائی گئی۔ ہمارے پرائمری سکول کے استاد مولانا عبدالکریم صاحب وہاں سے گذر رہے تھے۔ میری والدہ محترمہ نے ان سے کہا کہ میں اپنے بیٹے کو بھیج رہی ہوں، اس کا خیال رکھنا۔ مولانا نے انہیں یقین دلایا کہ آپ کا بیٹا انشاء اللہ بڑا آدمی بنے گا۔ صرف اس کو سکول سے غیر حاضر نہ ہونے دینا۔ میں استاد محترم سے دوڑ لگا کر آگے نکل گیا۔ پہلے مسجد میں حاضری دی۔ جہاں ایک گھنٹے کیلئے قران مجید کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور پھر سکول میں حاضری دی۔ پہلا دن انتہائی اچھا گذرا۔ استاد محترم نے بڑی عزت دی۔ وہ ہمارے گھر سے اکثر چائے پی کر جاتے تھے۔ اسلئے استاد محترم کو اس بات کا احساس تھا۔ ہمارا سارا خاندان جنگِ آزادی کے مجاہدین پر مشتمل تھا۔ اسلئے عزت و احترام تو لازمی تھا۔ چنانچہ اس وجہ سے میں دوسرے طالبعلموں سے زیادہ زبان دراز بن گیا۔ نہ استاد محترم کی طرف سے سزا کا خوف تھا اور نہ ہی گھر سے کسی سرزنش کا خوف۔ کیونکہ میری والدہ محترمہ نے مجھے شہزادوں کی طرح رکھا ہوا تھا۔ سردیوں میں گھر جب سرد ہو جاتے تو سب سے چھوٹے لڑکے کو کہا جاتا تھا کہ جا کر دروازہ بند کرو۔ میں نے انکار کر دیا۔ تینوں بھائیوں کے بچوں کی تعداد خاصی تھی۔ گھر خاصا بڑا تھا۔ باہر تین کمرے تھے۔ ایک میں چچا صاحب کی دوکان تھی۔ دوسرے دونوں خالی تھے۔ اکثر کوئی مہمان آ جائے تو انکو وہاں لے جایا جاتا تھا۔ اندر کے حصے میں چارپائیاں لگائی ہوئی ہوتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ لائین میں بستر ے لگے ہیں جیسا کہ ہسپتال میں کوئی وارڈ ہوتی ہے۔ میں جب تیسری جماعت میں گیا تو ہم گرمیوں میں ڈھوک کی زمین میں چلے جاتے تھے۔ گرمیوں میں یہ علاقہ واقعی جنت نظیر سے کم نہ تھا۔ جنگل اور ہریالی، خوبصورت پھول اور جنگل سے آنے والی ہواؤں سے اسقدر خوشبو آتی جیسے کسی نے اس علاقے کو عطر سے پورا علاقہ جنت بنا دیا ہو۔ دور نانگا پیر کی پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ مجھے اسکے اوپر جانے کا بہت شوق تھا۔ مگر میری والدہ نے منع کر دیا تھا کہ جب تمہارے والد آئیں گے تو تم کو ساتھ لیکر جائیں گے۔ اس پہاڑی کے بارے میں مشہور تھا کہ یہاں کسی بزرگ کی بیٹھک تھی۔ جو صدیوں پہلے اس پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھتے تھے اور ہر آنے جانے والے کو نیک کام کرنے کی ہدایت دیتے تھے۔۔ وہ پورا موسم گرما کا عرصہ وہاں گذارتے اور سردیوں میں کہیں اور چلے جاتے تھے۔ چنانچہ جب کافی عرصہ تک وہ دوبارہ گرمیوں میں نہ آئے تو وہاں پتھر ڈال کر ایک جگہ بنائی گئی اور اس بیٹھک کا نام اس بزرگ سے نانگا پیر کے نام منسوب کر دیا گیا۔ اسکے بارے میں یہ بھی کہاوت ہے کہ موصوف کی یہ شائید آخری آرام گاہ تھی۔ مگر کسی نے اس سلسلے میں تحقیق نہیں کی۔ کیونکہ اس بیٹھک کو کھودنا ممکن نہیں تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک رات انتہائی خوبصورت چاندنی رات کے دوران میں نے والدہ صاحبہ سے مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ مکان کے اوپر چڑھ کے بیٹھتے ہیں۔ میری ولدہ نے کہا بیٹا رات کو اسطرح

نہیں جا سکتے۔ کیونکہ کوئی ڈاکو آ کر تمہاری والدہ کو اٹھا کر لے جائے تو اور تم کو مار ڈالے تو کیا ہوگا۔ میں نے ایک بڑا مرغ ذبح کرنے کا ایک چاقو جسے عرف عام میں وہاں چھرا کہا جاتا ہے، اٹھایا اور والدہ کا ہاتھ پکڑا اور مکان کے اوپر لے آیا۔ ماں! میں نے پورے اعتماد سے کہا کہ کسی کی جراءت نہیں جو میری ماں کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھ سکے۔ میں اسکو کاٹ ڈالوں گا۔ میری ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس دن ہم رات کے دو بجے تک مکان کے اوپر بیٹھے رہے۔ پورا علاقہ خاموش تھا۔ کبھی کبھار جنگلی جانوروں کی آوازیں آتیں۔ پھر میری والدہ نے اپنی دُکھ بھری کہانی سنائی جو ساری زندگی میرے ساتھ رہی۔ میری والدہ ابھی چند سالوں کی تھیں کہ انکے والد ایک درخت سے نیچے گر کر وفات پا گئے۔ وہ درخت ہمارے بن بہک کے علاقے میں تھا۔ وہ زمین ہمارے حصے میں آئی تھی۔ انکا چند ماہ کا بھائی تھا اور انکی والدہ اب بے سہارا ہو گئے تھے۔ مگر انکے بڑے بھائی ایک سخت ترین اور بہادر انسان تھے۔ وہ علاقے کے مانے ہوئے شہسوار تھے۔ اور اکثر انکی سرپرستی میں پرورش پاتی رہی۔ انہوں نے مجھے اپنے بچوں سے زیادہ پیار دیا۔ میری والدہ بہت ہی سیدھی، سادہ طبیعت کی تھیں۔ تعلیم نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ عورتوں کی تعلیم کا تصوّر ہی نہیں تھا۔ میری والدہ ابھی جوان اور خوبصورت تھیں۔ اسلئے رشتہ داروں نے دباؤ ڈالا کہ شادی کرلو۔ انکی سادہ طبیعت انکے لئے مصیبت بن گئی۔ جب انہوں نے اپنے رشتہ داروں کو صاف کہہ دیا کہ میں شادی نہیں کرسکتی۔ کیونکہ میرا بیٹا ہے۔ میں اسکی پرورش کرونگی۔ بیٹی کی کسی کو پرواہ نہیں تھی۔ بڑی ہو جائیگی تو شادی کروا دیں گے۔ بس پھر رشتہ داروں نے منصوبہ بندی کے تحت خاموشی سے میرے بھائی کو قتل کر دیا اور یوں میری والدہ کی شادی دوسری جگہ کروا دی گئی۔ اور میں اپنے تایا کی سرپرستی میں رہنے لگی۔ میرے تایا نے تین شادیاں کر رکھی تھیں۔ بہت ہی خوبصورت انسان تھے۔ مگر کچھ عرصہ کے بعد انمیں سے کسی ایک نے انکو زہر دے دی اور وہ لاہور ہسپتال میں فوت ہو گئے اور وہاں ہی دفنا دیئے گئے۔ اب میں اکیلی رہ گئی۔ سب کو علم تھا کہ میرا بھائی قتل کیا گیا ہے۔ مگر کسی کو اسکی پرواہ نہ تھی۔ ڈوگرہ حکومت کا دور تھا۔ لوگ غریب تھے۔ پولیس سے ڈرتے تھے۔ اس لئے میرے بھائی کو دفنا دیا گیا۔ اور یوں وہ قاتل ہمارے سامنے خوشی سے گھومتے رہے۔ تایا جان بھی کچھ نہ کر سکے۔ بیٹا اب مجھے ڈر لگتا ہے کہ کوئی تمہیں مجھ سے چھین نہ لے گا۔ میں چاہتی ہوں کہ تم بڑے ہو کر اس جگہ سے دور کہیں چلے جاؤ۔ پڑھو، بڑے آدمی بنو۔ اور مجھے یہ ڈر نہیں ہوگا کہ میرے بھائی کی طرح تمہیں بھی وہ مار ڈالیں گے۔ یہ بیوقوف لوگ ہیں۔ کسی کو ترقی کرتا نہیں دیکھ سکتے۔ انمیں خدا کا خوف نہیں ہے۔ اسلئے کسی کے ساتھ جھگڑا مت کرنا۔ خاموشی سے زندگی گذارنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ یہ لوگ تیز زبان والوں کی زبانیں بند کرنے کا ہنر بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ ہم سات بہن بھائی تھے۔ تین بھائی اور چار بہنیں ۔ انمیں سے بڑی بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ اور دوسرے بہن بھائیوں کی ذمہ داری اب میری تھی کہ انکو صحیح راستے کی طرف لگاؤں۔ میری والدہ انتہائی سادہ مزاج تھیں۔ پونچھ ایک پرانی ریاست تاریخ کے ہزاروں اتار چڑھاؤ سے گذری ہے۔ یہاں ذریعہ معاش زراعت ہے۔ زیادہ علاقہ پہاڑی ہے۔ اور ہر قبیلے کی اپنی سیاست ہے۔ اور پھر قبیلہ کے اندر درجن بھر ٹھیکیدار ہیں۔ جنکا ذریعہ معاش بنیادی طور پر سیاستدانوں کی مدد کر کے روزگار حاصل کرنا ہے۔ مذہبی رواداری، اخلاق اور ایک دوسرے سے تعاون کا فقدان ہے۔ جسکی ذرا بھر پوزیشن ہے وہ اسکو برقرار رکھنے کیلئے قتل سے بھی باز نہ آئیگا۔ لوگ سادہ طبیعت کے ہیں۔ میری پیدائش ۱۹۵۴ء کی ہے اور اس دور میں ذرائع آمدورفت کی کمی تھی۔ دیہات میں سڑکوں

کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اکثر لوگ دور دور سے خوراک اور بنیادوں ضروریات کیلئے پیدل جاتے تھے۔ زندگی انتہائی تکلیف دہ تھی۔ خاص کر خواتین کی زندگی سخت ترین اور انکی مشکلات کے بارے بات کرنا خود کو تکلیف دینے کے برابر ہے۔ سارا گھریلو انتظام خواتین کے سپرد تھا۔ جو افراد ملک سے باہر تھے۔ یہ خواتین گھر کا سارا نظام خود چلاتی تھیں۔ بچوں کی سرپرستی، گھریلو جانوروں کی دیکھ بھال، گھاس کاٹنے کا کام انکے سپرد تھا۔ اس دوران بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں تمام ذمہ داریاں ان خواتین پر تھیں۔ کسی خاتون کو میں نے خوش نہیں دیکھا۔ کیونکہ کام اتنا زیادہ تھا کہ خواتین کی مدد کا کوئی اور انتظام نہیں تھا۔ اکثر علاقے کے رشتہ دار انکی مدد کرتے تھے۔ ابتدائی دور میں تعلیم کے سلسلے میں مقامی علماء کرام خاصے مددگار ثابت ہوتے تھے۔ انکی وجہ سے بیشمار طالب علم دینی اور دنیاوی تعلیم سے آراستہ ہوئے۔ اکثر پرائمری سکول میں لکڑی کی تختیاں استعمال کی جاتی تھیں۔ میرے پاس پانچویں جماعت تک ایک تختی تھی جو لکڑی سے بنائی جاتی تھی۔ اور اسکو کوئلے سے بنائے گئے چارکول سے کالا کیا جاتا تھا۔ اور پھر ہم اس پر خوشخطی لکھ کر استاد محترم کو دکھاتے تھے۔ میری تختی آدھی ٹوٹی ہوئی تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی جانور نے اسکو چبا لیا ہو۔ پانچویں جماعت پاس کرنے کے بعد میں نے وہ تختی اپنی والدہ کے سامنے کلہاڑی لیکر اسکو دو ٹکڑے کرنے کی رسم ادا کی۔ پورا گھر ہنس ہنس کر انکا برا حال ہو گیا۔ یہاں تک کہ نزدیک کے مکانات سے خواتین بھی بھاگ کر آئیں کہ کیا ایسا خوشی کا موقع آ گیا ہے۔ میں غصے میں تھا۔ مگر سارے گھر والے خوش ہو رہے تھے۔ اور گویا مرے غصے پر قہقہے لگا رہے تھے۔ انہیں شائد اس بات کا احساس نہیں تھا کہ میں پانچ سال لکڑی کی آدھی تختی یا بورڈ پر خوشخطی لکھ کر امتحان پاس کیا۔ جبکہ میرے ساتھیوں کے پاس خوبصورت انتہائی بہتر طریقے سے تیار کردہ تختیاں تھیں اور مجھے اس بات کا افسوس ہے کہ ان پانچ سالوں میں مجھے اپنے ساتھیوں کے طعنے سننے پڑے۔ ان پانچ سالوں مجھے یہ اعزاز حاصل رہا کہ میں بارہ بجے اپنے پرائمری سکول کے استاد صاحب کو چائے بنا کر پیش کرتا رہا۔ اس وجہ سے بارہ بجے کی چائے مجھے بھی مفت مل جاتی۔ جو ایک اعزاز تھا۔ کچھ عرصہ بعد جب میرے استاد محترم تبدیل ہو گئے اور انکی جگہ راجہ محمد افسر صاحب تشریف لائے تھے تو مجھے اس اعزاز سے ہاتھ دھونے پڑے۔ وجہ کچھ یوں ہوئی کہ میں نے تختی نہیں لکھی اور کچھ دوسری کمزوریاں سامنے آ گئیں ۔ استاد محترم بھٹی شریف کے نمبردار تھے۔ سخت طبیعت کے تھے۔ فوراً حکم صادر کیا کہ تم چائے نہیں بنا سکتے۔ کیونکہ تم وقت ضائع کرتے ہو اور تمہیں پڑھائی پر توجہ دینی ہوگی۔ میں نے انکے احکامات کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ مجھے علم تھا کہ میری جیسی چائے اور کوئی بنا نہیں سکے گا۔ اور استاد محترم کو مجبور ہو کر میرے پاس ہی آنا ہوگا۔ شام کی چائے وہ ہمارے گھر میں پیتے تھے۔ کیونکہ ہمارا گھر راستے میں تھا اور میرا چچا کی دوکان تھی۔ خیر میرے ایک کلاس فیلو نے یہ کام سنبھالا۔ شائد اس نے گھر میں کبھی چائے نہیں دیکھی تھی۔ اسلئے موصوف نے ایک کپ چائے بنانے کیلئے پورا ڈبہ دیگچی میں ڈال دیا۔ جب موصوف چائے لیکر انکے دفتر کی طرف گئے تو چائے کی خوشبو کی مہک محسوس کی تو پہاڑی زبان میں بولے (اللہ اللہ اَج تے بڑے ہولے اُٹھنے) یعنی آج تو خوشبو نے کمال کر دیا ہے۔ جب چائے کا گھونٹ بھرا تو انکو احساس ہوا کہ دو ہفتوں کی چینی اور چائے اس ایک دفعہ ایک پیالی کی نذر ہو گئی ہے۔ اسکو کچھ نہیں کہا۔ صرف اتنا پوچھا کہ پہلے کبھی چائے بنائی ہے تو بولا جناب اس سے قبل تو میں نہیں بنائی۔ خیر استاد محترم خاموش ہو گئے۔ مجھے دوبارہ بلایا۔ میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا مگر میں نے استاد کے احترام میں ضبط سے کام لیا۔ بہرحال استاد محترم نے صرف اس شرط پر یہ کام

میرے سپرد کیا کہ میں سکول کا کام مکمل کر کے لاؤنگا۔ اسکے بعد بیچارے میرے کلاس فیلو کو پانچویں جماعت تک ساتھیوں کے مذاق کا سامنا کرنا پڑا۔

اس دوران ہماری سب سے زیادہ مشکل یہ رہی کہ جب ہم گرمیوں میں بلندی پر چلے جاتے ۔ جسے عرف عام میں ڈھوک کہا جاتا ہے تو وہاں سے آنے جانے میں خاصی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا۔ بارش کے دوران نالہ میں طغیانی آجاتی اور یوں ہمارے لئے گھر جانا مشکل ہوجاتا تو گاؤں میں رشتہ داروں کے ہاں رہائیش اختیار کرتے۔ پھر ایک دن میں نے جمعہ کے دن چھٹی کرنے کا فہصلہ کرلیا۔ جب میں سکول حاضر ہوا تو استاد صاحب نے لائین میں کھڑا کر دیا۔ پوچھا۔ کیوں جمعہ کو نہیں آئے۔ میں نے کہا جناب جمعہ اسلامی طرزِ زندگی کے مطابق چھُٹی کا دن ہے۔ مسلمان ہوں۔ سوچا، مذہب پر عمل کروں۔ استاد خاموش ہوگئے۔ اور مجھے واپس کلاس میں بھیج دیا۔ اس کا ذکر چچا صاحب سے کیا تو موصوف نے کہہ دیا کہ آپ آئیندہ اسکو وارننگ دے دیں۔ دوسرے دن استاد صاحب نے کہہ دیا کہ حکومت ہماری نہیں ہے۔ ہم حکومت کے احکامات پر عمل کرتے ہین۔ اسلئے وٗئیندہ گیر حاضری نہیں ہونی چاہیئے۔ آپکے چچا صاحب سے بات کر دی ہے۔ اسلئے آئیندہ احتیاط رہے۔ پھر وہ مجھے سمجھ گئے۔ کہنے لگے، بیٹا! مجھے بیوقوف بنانے کی ضرورت نہیں۔ راستہ واقعی لمبا ہے۔ مجھے اس کا علم ہے۔ دشوار گذار بھی ہے مگر ہم لوگوں کے پاس کوئی متبادل راستہ نہیں ہے۔ حکمران چور ہیں۔ اپنا گھر بنا رہے ہیں۔ اسلئے آئیندہ تم پڑھو اور آواز اٹھاؤ۔ میرے دور میں بچیوں کا کوئی سکول نہیں تھا۔ گرل سکول کا تصوّر نا پید تھا۔ بچیوں کو سکول میں داخل کروانے کا رواج نہ تھا۔ اور جب میں نے سکول کے استاد صاحب سے اس کا ذکر کیا کہ جناب جب قران حکیم اور احادیث میں مرد اور عورت دونوں پر علم فرض قرار دیا گیا ہے ہے تو لڑکیوں کو سکول میں کیوں داخل نہیں کیا جاتا اور اگر لڑکیوں کو الگ سکول کی ضرورت ہے تو ایسا کیوں نہیں ہوتا۔ میرے استاد صاحب نے میری طرف دیکھا اور بولے جاہلوں کی بستی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ یہ تفریق ہمارا مذہب نہیں کرتا۔ یہ ہمارا معاشرہ کرتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے قبل ڈوگرہ راج میں پونچھ سب سے کم پیداواری علاقہ تھا۔ زراعت کے میدان میں بھی پونچھ ریاست اتنی زرخیز زمین نہیں تھی۔ یہاں کے لوگ انتہائی جفاکش اور دلیر تھے۔ اور برطانوی دربار کو ایسے افراد کی ضرورت تھی۔ اسلئے یہ لوگ جنگ عظیم اوّل اور دوم میں خاصی تعداد میں بھرتی کئے گئے۔ اور جرمن جنگ میں اتحادی فوج کے ساتھ شریک ہوئے۔ انمیں میرے والد بھی شامل تھے۔ میرے والد اکثر کہا کرتے تھے کہ ہم دوسروں کی بُری عادتیں نسل درنسل منتقل کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے سب پرانی ہندوانہ رسمیں ہم میں ایسی منتقل ہوئی ہیں کہ ہم انکو مذہبی فریضہ سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں اور قرانی احکامات کے باوجود ہم نے خواتین کو تعلیم کے میدان میں آگے نہیں آنے دیا۔
جب میں نے بیس بگلہ مڈل سکول میں داخلہ لیا تو میں نے ایک دن والد صاحب سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ اب مشکل یہ تھی کہ میرے پاس کرائے کی رقم نہیں تھی۔ ایک دن میری والدہ نے مجھے نئے جوتے دیئے کہ بیس بگلہ سے کروا کر لے آؤ۔ میں نے وہ جوتے فروخت کئے اور اپنی والدہ کو بتائے بغیر جہالہ بازار پہنچا اور سیدھا بس پ بیٹھ گیا۔ کنڈ یکٹر نے سوال کیا مگر میں نے اسے مطمئن کر دیا کہ مری اترنے پر میرے والد وہاں موجود ہونگے۔ اس نیسنی نیگ میں مجھے اتار دیا۔ میرے والد اس وقت برازیل کے سفارتخانہ میں کام کرتے تھے۔ سنی نیگ اتر کر میں ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ زندگی میں پہلی بار کوہالہ پُل سے اس طرف آیا تھا۔ دیکھنا شروع کر دیا کہ کہیں کوئی اپنا نظر آجائے۔ اس دوران ایک شخص نظر آیا جو ہر

گذرنے والی کار کو دیکھ رہا تھا۔ مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے جب قریب جا کر دیکھا تو یہ راجہ بلی داد خان بھٹی شریف تھے۔ میں نے ان سے مدد کی اپیل کی۔ موصوف مجھے لیکر مری کی مال روڈ پر لے گئے۔ کہنے لگے آپ کے والد راجہ بلور خان اکثر پوسٹ آفس میں آیا کرتے ہیں اور وہاں سے ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے جاتے ہیں۔ مگر جب وہ دیر تک نہ آئے تو میں نے ان سے راستے کا پتہ لیا اور برازیل کے سفارتخانہ میں پہنچ گیا۔ میرے والد مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ مگر موصوف مجھے دیکھ کر بھول گئے کہ میں نے اکیلے آکر غلطی کی ے۔ مجھے لیکر مال رود پر گئے۔ سب دوکانداروں سے میرا تعارف کروایا اور کھانا کھانے کے بعد ہم واپس ہوئے اور چند دن رہنے کے بعد میں واپس گھر پہنچا۔ گھر والوں کو بتایا گیا کہ اب تمہارا بیٹا واپس نہیں آئیگا۔ میں جب گھر پہنچا تو میری والدہ کا بُرا حال تھے۔ مجھے بہت افسوس ہوا۔ ان سے معافی مانگی۔ مگر موصوفہ نے کوئی شکائیت نہ کی۔ وہ مجھ سے حد سے زیادہ پیار کرتی تھیں۔ اور انہیں ہر وقت میرا فکر رہتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں تھا کہ انکو میری فکر اسقدر کیوں ہے۔ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھینہ تو ہم کوئی جاگیردار تھے۔ نہ ہمارے پاس دولت تھی۔ پھر انکی بات میری سمجھ میں نہ آتی کہ آخر انہیں میری زندگی خطرے میں کیوں نظر آتی ہے۔ ہمارے خاندان میں میرے چچا صاحب انتہائی پیار کرنے والے انسان تھے۔ جب چائے بناتے تو مجھے آواز دیتے۔ آؤ چائے پی لو۔ ایسے نیک لوگوں کی موجودگی میں آخر ڈر کس بات کا تھا۔

پھر ایک دن باتوں باتوں میں میں نے والدہ محترمہ سے پوچھ لیا کہ آپ تو نانا جی کی واحد اولاد تھیں اور نانا جی کا سارا وراثت کا حصہ آپ کے نام ہونا چاہیئے تھے۔ تو پھر وہ لوگ آپ کی زمین کیوں استعمال کرتے ہیں۔ فوراً سوال کیا کیا، تمہیں کیسے معلوم ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں اکثر مدرسہ فیض القران بیس بگلہ میں پڑھائی کے بعد مولانا عبدالغنی صاحب کے پاس بیٹھتا ہوں۔ مولانا عبدالغنی مرحوم بیس بگلہ مدرسہ کے بانی تھے اور ۱۹۴۷ء میں امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی کے حکم پر آپکو علاقے کی ڈیفنس کمیٹی کا صدر بنایا گیا تھا تا کہ وہ نوجوانوں کو علاقے کی حفاظت اور باہر سے حملہ آوروں کو روکنے کیلئے تیار کرسکیں۔ مولانا فاضل دیوبند تھے۔ ایک دن میں نے ان سے شرعی قوانین کے بارے میں چند سوالات پوچھے اور اپنی والدہ محترمہ کی جائیداد کے بارے مین سوال کیا تو مولانا نے کہا۔ ہاں بیٹا قانونی طور پر تو وہ جائیداد کی مالک ہیں۔ مگر یہاں لوگ نام کے مسلمان ہیں۔ جب انکے ذاتی مفادات کی بات آتی ہے تو وہ مذہب کو بھول جاتے ہیں۔ شائید انکو بھی علاقے کی صورتِ حال کا علم تھا۔ فوراً بولے بیٹا ایسا کرو۔ اس مسئلہ پر کسی سے ذکر نہ کرو۔ تعلیم پر توجہ دو۔ یہ بڑے لوگوں کا کام ہے۔
خیر جب والدہ محترمہ کو میں نے یہ ساری بات بتائی تو بہت خوش ہوئیں۔ بولیں۔ یہ کام بڑوں کا ہے۔ کبھی اس بات کا ذکر اور کسی سے نہ کرنا۔ مولانا صاحب عقلمند اور نیک انسان ہیں۔ انہیں صورت حال کا علم ہے۔ اور مجھے کہا کہ آئیندہ اس بات کا ذکر کسی سے نہیں ہونا چاہیئے۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ آخر یہ کونسا راز ہے جسے چھپایا جا رہا ہے۔ مگر میں خاموش رہا۔
بن بہک کیا علاقہ پہاڑوں کے درمیان تھا۔ نانگا پیر کی چوٹی درختوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ چاندنی رات کو یہ علاقہ اتنا پرسکون لگتا تھا کہ جیسے یہ کوئی دوسری دنیا ہو۔ میں رات کو خاموشی سے مکان کے اوپر جا کر بیٹھ جاتا اور کئی گھنٹے گذارتا۔ ٹھنڈی ہوا کے ساتھ ساتھ اردگرد سے آنے والی پھولوں کی خوشبو سے معطر یہ علاقے واقعی جنت کا نمونہ تھے۔ یہاں کے لوگ انتہائی دلیر، جانباز اور سخت طبیعت کے لوگ تھے۔ اسلئے

میں کبھی چوری اور ڈاکے کے واقعات نہیں دیکھے اور نہ ہی اس سنسان علاقے میں کوئی ایسی واردات ہوئی۔ اکثر دن کے وقت مقامی لڑکیاں جنگل سے گھاس اور سبزیاں اکھٹی کرتیں۔ جنمیں مختلف اقسام کی انتہائی اہم سبزیاں ہوتیں تھیں۔ گھاس کاٹنے کے دوران میں پہاڑی گانے مقامی لوگ اکثر کان لگا کر سنتے۔ میرے والد گرمیوں میں گھر آتے تو رات کے وقت مکان پر میرے ساتھ بیٹھتے اور پہاڑی گانے گاتے اور انکی آواز پہاڑیوں سے ٹکرا عجیب سماں پیدا کرتیں۔ عورتیں اور مرد انکی سریلی آواز کو سنتے اور دوسرے دن صبح صبح علاقے کی خواتین دودھ اور مکھن لے آتیں اور والدہ صاحبہ کے حوالے کرتیں کہ آپ کیلیئے لائے ہیں۔ مگر مجھے علم تھا کہ یہ خواتین والد صاحب کو دیکھنے آتی ہیں۔ اکثر وہ والدہ صاحبہ سے ذکر کرتیں کہ آپ کتنی خوش قسمت ہیں۔ اتنا خوبصورت انسان ملا ہے۔ ہمارے گھر جا کر دیکھو۔ پھر میری والدہ انکو سمجھاتیں کہ دیکھو یہ میرے صاحب جو ہیں یہ کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ شہر میں رہتے ہیں۔ آپ کے مرد بیچارے دن رات کام کرتے ہیں۔ ان کی زندگیاں اتنی آسان نہیں ہیں۔ اس لئے انسان کی قدر کرنا سیکھو۔ پھر وہ پہاڑی میں کہتیں کہ ''ایکدن آساڑیاں حیواناں گننے رہ تے پتہ چلسی'' کہ ایک دن ہمارے ان جانور نما انسانوں کے ساتھ رہو تو پھر تمہیں احساس ہو۔ اور پھر وہ ہنس کر چل دیتی۔ والد صاحب پہاڑی کے اچھے شاعر بھی تھے۔ اور آواز بھی بہت سریلی تھی۔ وہ انتہائی وطن سے محبت کرنیوالے شخص تھے۔ موسم بہار انکا پسندیدہ موسم تھا۔ اکثر جب ہمارے علاقے میں ایک مخصوص پرندہ جسے ہمارے ہاں کوکو (coco) کہتے تھے۔ اپنی آواز اس طرح نکالتا تو پورے گاؤں والے کہتے تھے کہ اب کوکو کی آواز آرہی ہے اور اسکے ساتھ ہی بلور خان بھی آرہا ہوگا کیونکہ بہار آئے اور بلور خان نہ آئے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ دوسرے دن والد صاحب کی آمد ہوتی اور گاؤں میں انکی ملاقاتوں کا سلسلہ چل نکلتا۔ موصوف انتہائی درد دل رکھنے والے شخص تھے۔ وہ دوسروں کو دیکھ کر خوش ہوتے تھے۔ پورے گاؤں کے لوگ انتہائی سادہ لوح تھے۔ خسوصاً لڑکیوں اور خواتین کیلیئے اگر کوئی معمولی چوڑیاں لے آتا تو وہ لگا کر پورے گاؤں کا دورہ کرتیں اور سب کو دکھاتی تھیں۔ میرے والد سال کی جمع شدہ پونجی چوڑیوں اور خوبصورت ہاروں پر خرچ کر دیتے اور انگوٹھیاں اور کانوں کی بالیاں خریدتے اور گھر آکر سب کو بتاتے کہ میں نے پورا سوٹ کیس جیولری کا خریدا ہے اور میں اس کو فروخت کر کے منافع کماؤں گا۔ مگر ہم کو معلوم تھا کہ وہ گھر کی بچیوں، رشتہ داروں اور گاؤں کی خواتین کو یہ تحفے دینے کیلیئے لائے ہیں۔ دوسرے دن انکا سوٹ کیس خالی ہو جاتا۔ گاؤں کی بچیاں اور میری چچازاد بہن اور دوسری خواتین سب کو دکھاتیں کہ ہائے بلور چچا نے کتنی خونصورت جیولری لائی ہے اور والد صاحب انکو دیکھ کر خوش ہوتے اور وہ دعائیں دیتیں۔ انکی آنکھوں میں اکثر آنسو دیکھے۔ اکثر کہتے افسوس ہمارا علاقہ جنت سے کم نہیں۔ مگر روزگار کو کوئی ذریعہ نہیں۔ سیاست دان چور ہیں۔ وہ کبھی اس علاقہ کو ترقی دینے کی کوشش نہیں کریں گے۔ کیونکہ لوگ خوشحال ہونگے تو انکی حرام کی کمائی میں کمی آجائیگی۔ انکو ۱۹۴۷ء کی جنگ میں پونچھ محاذ پر بہادری دکھانے اور حملہ آوروں کو بھگانے پر باغ شہر میں زمین دی گئی۔ جہاں موصوف نے دوکان تعمیر کی۔ اور اپنے ماموں زاد بھائی راجہ محمد خان کے ساتھ ملکر دوکان کھولی۔ مگر امیر شریعت کو جو رپورٹ موصوف نے محاذ جنگ کے بارے میں دی۔ تو مولانا عبداللہ مرحوم نے انکا ذکر تقریر میں کیا۔ کہ غلطیاں کہاں نہوئیں۔ جب نئے حکمرانوں کو پتہ چلا تو انکی دوکان پر محکمہ صحت کے ذریعے قبضہ کروایا گیا اور سارا سامان بھی ساتھ لے گئے۔ بعدازاں سردار ابراہیم صاحب نے معاوضہ کا حکم دیا۔ مگر ایسا لگتا تھا کہ یہ کاغذی کاروائی تھی۔ اس

سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے سیاستدان کس حد تک اخلاقی گراوٹ کا شکار ہیں۔ اس سلسلے میں سردار عبدالقیوم صاحب سے لیکر سردار عتیق احمد تک سب نے کاروائی کا حکم دیا۔ یہ محض کاغزی کاروائی تھی۔ جبکہ یہ لیڈر اربوں روپے قومی خزانے سے لوٹتے رہے۔ مگر ایک مجاہد کو اس کا حق دینے کی اخلاقی جراءت کا مظاہرہ نہ کر سکے۔ اسکے بعد میرے والد نے آگے جانے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ سارا ریکارڈ میرے حوالے کیا اعر کہا اس کا جواب قیامت کے دن ان سے لونگا۔ پھر اس بارے میں کسی سے ذکر نہ کیا۔ اس دور میں ریڈیو گاؤں کے بہت کم افراد کے پاس ہوتا تھا۔ ۱۹۶۵ء میں مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ والد صاحب ایک ٹیپ ریکارڈر جسے گرام فون کہتے تھے۔ اپنے ساتھ لائے اور نور جہاں اور لتا منگیشکر کے نغمے کے ریکارڈ لائے اور جب وہ اسکو گھما گھما کر چلاتے تو ریکارڈ کی سوئی چلتی اور یوں میوزک شروع ہوتا تو پورا گاؤں اُمڈ آتا۔ ان کیلیئے یہ عجوبہ تھا۔ میرے ماموں راجہ محمد خان صاحب نیویارک سے واپس ہوئے تو اپنے ساتھ ریڈیو اور پانچ فائر والی بندوق لائے۔ ریڈیو اور خبریں سننے کا سلسلہ چل نکلا اور پھر یہ سلسلہ چند سالوں میں آگے بڑھا۔ جو بھی پاکستان نوکری کرتا تو اپنے ساتھ ٹرانسسٹر ضرور لاتا۔ لوگ سیدھے سادے تھے۔ قدرتی غذائی اجناس کا عام استعمال ہوتا تھا۔ کھانے پینے کی کوئی شے باہر سے منگوانے کا رواج نہ تھا۔ سوائے چینی، چائے اور آٹا یا گندم کی ضرورت پڑتی تھی۔ مکھن، گھی اور دودھ عام تھا۔ سبزیاں، پھل اور فروٹ عام تھے۔ اکثر لوگ پھل لیجاتے تھے۔ فروخت کرنے کا نظام نہ تھا۔ قدرتی غذائیں عام تھیں۔ سبزیاں وافر مقدار میں تھیں۔ لوگ زیادہ تر سبزیاں استعمال کرتے تھے اور درجن بھر مختلف سبزیاں مکئی کی فصل کے ساتھ لگائی جاتی تھیں۔ تماٹر، آلو، مرچ کاشت کرنے کا عام رواج تھا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ صحتمند تھے اور بچوں کے چہرے لال سرخ ہوتے تھے۔ لوگوں کی عمریں اکثر زیادہ ہوتی تھیں۔ میں نے بیمار لوگ بہت کم دیکھے۔ کیونکہ اکثر یہ لوگ زندگی طویل عرصہ تک گذارتے تھے۔ سڑکیں نہ تھیں اسلیئے کئی میل تک پیدل سفر کرتے تھے۔ اور یہ انکی صحت کا اصل راز تھا۔ اس کے ساتھ ہی جنگلات زیادہ تھے۔ لوگ درختوں کی خاص طور پر حفاظت کرتے تھے۔ کئی بار ناڑیاں سے گذرتے ہوئے اکرورڑنہ جہولہ کے جنگل سے دن کے وقت گذرتے تو اتنا گھنا جنگل ہوتا تھا کہ باہر سے دھوپ کی روشنی جب اندر جاتی تو ایسا لگتا تھا کہ چاندنی رات ہے۔ وہ منظر دیدنی تھا۔ اس جنگل میں ہر طرح کے درخت ہوتے تھے۔ افسوس آہستہ آہستہ جنگل کاٹے جانے لگے۔ لوگوں کو لکڑی جلانے کی ضرورت تھی۔ سردیوں میں اور کئی راستہ بھی نہ تھا۔ مگر کاٹے گئے درختوں کو دوبارہ لگانے کے بارے میں کسی نے نہ سوچا تھا۔

گاؤں میں معتبر اشخاص میں سردار سلیمان خان، نمبردار حیدر خان۔ ہاڑی کھیت سے چچا فرید خان، فارسٹر گل احمد خان قابل ذکر تھے۔ مگر مولانا عبدالغنی صاحب ناظمِ اعلیٰ مدرسہ فیض القران بیس بگلہ کی عزت واحترام زیادہ تھا۔ گاؤں میں دَم کا رواج تھا۔ (دَم پہاڑی زبان میں لڑکی کو شادی پر دینے کے عوض رقم کی وصولی ہے) اکثر بڑی عمر کے لوگ دولت دیکر نوجوان لڑکیوں سے شادی کرتے۔ یہ زبردستی کی شادیاں ہوتی تھیں۔ میں نے بچپن میں کئی شادیوں میں لڑکیوں کو روتے دیکھا۔ مولانا عبدالغنی کو پتہ چلا تو انہوں نے فیصلہ کر لیا کہ نخاح سے پہلے والد کو تفتیش کے دور سے گذارہ جانے لگا۔ اور اس طرح انہوں نے دَم کا خاتمہ کیا۔ شادیوں میں اخراجات کم کروانے اور لوگوں کو قرضوں کے بوجھ سے نجات دلائی۔ انکا کہنا تھا کہ شادی کی رسم میں سادگی کروتا کہ شادی شدہ جوڑے کے قرضوں کو آگے چل کر یہ قرضے اپنے بچوں کے نام پر نہ منتقل کرنے پڑیں۔ مجھے مولانا کی یہ باتیں بہت اچھی طرح یاد ہیں کہ جتنی

حیثیت ہواسی کے مطابق خرچ کرو۔سادگی سے جوڑوں کو رخصت کرو۔تا کہ انکو قرضوں کا خوف نہ ہو۔پہلے دن سے ہی انکو قرضوں کے بوجھ تلے دبا دو گے تو وہ اپنی ازدواجی زندگی سُکھ اور چین سے کیسے گذاریں گے۔

گرمیوں میں بھٹی شریف اور ہمارے بن بہک کے علاقے سے سکول جانے والوں کیلئے یہ علاقہ میدان جنگ سے کم نہ تھا۔کسی کے پاس گھڑی نہیں تھی۔اسلئے وقت کا تعین بہت مشکل تھا۔کہ کب روانہ ہوں تا کہ وقت پر پہنچ جائیں۔بیس بگلہ تک تو آسانی تھی۔بیس بگلہ میں سب سے پہلے استاد سید اشفاق حسین شاہ ملے۔نوجوان تھے۔ایک دن میں نے نانگا پیر پر ایک مضمون لکھا اور اسکی چوٹی پر بیٹھ کر میں نے پہاڑوں کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کی ایسی معیاری کہانی لکھی کہ استاد محترم میری مہارت کے دلدادہ ہو گئے۔اور فوراً محمد حبیب جان کی جگہ محمد حبیب جالب رجسٹر پر لکھ دیا اور کہا کہ آئیندہ تم اسی نام سے جانے جاؤ گے۔انکے خیال میں میں آگے چل کر ایک نامور رائٹر بنوں گا اور اس کیلئے نام کی شناخت کو الگ کرنا ضروری ہے۔اسکے بعد میرا نام حبیب جالب پڑ گیا۔ملوٹ آکر اسمیں اور نکھار آیا۔جب استاد سیّد عتیق اللہ شاہ صاحب نے مجھے اور میرے پھوپھی زاد بھائی عبدالقدیر خان کو تقریر کرنے والی (ڈیبیٹ) ٹیم میں شامل کیا۔۔ہم دونوں صبح تلاوت کلام پاک کرتے اور اکثر جلسوں میں خطاب کرتے۔اور یوں ہم مقرّرین میں شامل ہو گئے۔ملوٹ چھوٹا سا بازار تھا۔مسجد تھی اور ہائی سکول کی عمارت تھی۔اسی دوران یہاں ایک بہت بڑا حادثہ بھی ہوا تھا۔جسمیں سائینس کے استاد اشرف صاحب وفات پا گئے۔وہ ایک تجربہ کر رہے تھے کہ آگ لگ گئی اور وہ ٹرے لیکر باہر بھاگے تا کہ بچوں کو بچا سکیں۔آگ نے انکو لپیٹ میں لے لیا۔مگر تجربہ گاہ اور بچوں کو آنچ نہ آنے دی، یہ ایک بڑا سانحہ ہوا تھا۔ملوٹ تک کا سفر خاصا مشکل تھا۔سب سے خطرناک جگہ بیٹریانہ پڑ (پہاڑی) تھی جہاں سے گذر کر جانا ہوتا تھا۔میں ہر روز کلمہ پڑھ کر وہاں سے آہستہ آہستہ نیچے آتا۔اگر تھوڑا سا پاؤں پھسل جائے تو موت یقینی تھی۔کیونکہ لاش کوئی ہزار گز نیچے تلاش کرنا پڑے گا۔ملوٹ پہنچتے تو آگے راجہ علی آفیسر صاحب فزیکل انسٹرکٹر تھے جو ہر صبح ورزش کرواتے تھے۔جب ہم پہنچتے تو کوشش کے باوجود دیر ہو جاتی۔پھر میں نے ایک صبح نانگا پیر کی پہاڑی پر نگاہ دوڑائی اور والدہ صاحبہ کو بتایا کہ جب اس پہاڑی پر دھوپ آجائے تو ہمیں روانہ ہونا ہوگا۔چنانچہ اس طرح ہمارا تجربہ کامیاب رہا۔اور میں وقت پر پہنچنے لگا۔اب اتنا مشکل سفر کر کے جب ہم ملوٹ پہنچتے تو ہمارا بُرا حال ہو جاتا تھا۔جوتے پھٹنے شروع ہو جاتے۔نئے خریدنے کی ہمت نہ تھی۔ہمارے گاؤں کے موچی امام دین کے فرزند بشیر صاحب کی جوتے بنانے اور مرمت کرنے کی دوکان تھی۔ان سے میری بڑی دوستی تھی۔اسکی وجہ یہ تھی کہ میں نے انکے والد محترم کو گاؤں میں عزّت دلائی تھی۔ہوتا یہ تھا کہ ڈوگرہ دور میں گاؤں کے لوگ میراثی، نائی اور جوتے بنانے والے کو گاؤں میں زمین دیتے تھے اور اسکے عوض وہ گاؤں کے برتن بناتا تھا۔نائی سر کے بال ٹھیک کرتا تھا اور موچی گاؤں کے لوگوں کیلئے جوتے بناتا تھا اور ہر کوئی اسکے عوض فصل تیار ہونے پر ہر گھر اسمیں سے کچھ حصّہ دیتا تھا۔اس طرح انکا گذارہ ہوتا تھا۔انکو اکثر چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی۔یسب سے پہلے تو ایک بات نے بچپن میں مجھے مذاق کا نشانہ بنایا۔وہ امام شفیع صاحب تھے۔انکی داڑھی اور موچی امام دین کی داڑھی ملتی جلتی تھی۔ایک دن شادی میں امام صاحب بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے تمام لوگوں کے سامنے احتجاج کرنا شروع کر دیا کہ تم موچی ہو مگر ایک ماہ ہو گیا ہے، میرا جوتا مرمت نہیں کیا۔مولانا شفیع صاحب سمجھ

گئے۔کہنے لگے جاؤ بیٹا میں کل تمہارا جوتا لیکر آؤں گا۔شام کو پتہ چلا کہ وہ امام صاحب تھے۔امام دین دوسرے دن جوتا لیکر آئے اور پورے گھر کو صورت حال بتائی۔میری والدی سیدھی سادی تھیں۔کہنے لگی اب دونوں کی داڑھی سفید ہے۔میرے بیٹے کو کیا علم تھا کونسا امام ہے اور کون موچی ہے۔مگر میاں صاحب زندگی بھر یہ مذاق لیکر مجھ پر ہنستے رہے اور میں بھی اس ہنسی میں مجبوراً شریک رہا۔بہر حال جب مجھے پتہ چلا کہ امام دین کو چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے تو یہ روائت میں نے ختم کی۔ایک دن جب موصوف ہمار گھر آئے تو میں چادر چارپائی پر ڈالی اور ان کو بٹھایا۔پہلے تو انکار کیا مگر جب میں انے انکو بتایا۔اسلام میں کسی اونچ نیچ کا تصوّر نہیں ہے۔آپ بزرگ ہیں۔جوتے بنانا آپ کا ہنر ہے۔افسوس کہ یہ ہنر میرے پاس نہیں ہے۔ورنہ میں انتہائی مہنگے جوتے بنا کر پہنتا۔اسکی آنکھوں میں آنسو تھے۔میری والدہ کی طرف دیکھا اور بولے اکطر جان! تم نے بیٹا پیدا نہیں کیا ایک ہیرا پیدا کیا ہے۔پھر ایک ماہ بعد ایک خوبصورت جوڑا بوٹوں کا لیکر آئے اور مجھے انعام کے طور پر دیا۔اس کا ذکر جب انکے بیٹے کے سامنے ہوا تو وہ میرے دوست بن گئے۔اور یوں ایک نیکی کی وجہ سے میری زندگی میں آسانی پیدا ہو گئی۔اور مجھے بوٹوں کی مرمت پر اخراجات کی ضرورت نہ ہوئی۔

ورزش سے جان چھڑانے کی ترکیب: ہر صبح سکول پہنچ کر ورزش کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔تیزی سے چلتے ہوئے اکثر میرے پاؤں اور ٹانگیں زخمی ہوتی تھیں۔ایک دن راجہ علی آفیسر خانصاحب غصے میں آگئے۔اور کہنے لگے کہ تم کو آدھا گھنٹہ لیٹ آنے اور ورزش نہ کرنے پر بیٹھک لگانی ہوگی۔یہ کام تو کیا مگر دوسرے دن سیدھا انکے پاس پہنچا۔ورزش کرنے کیلئے لڑکے لائن میں کھڑے تھے۔میں نے بن بہک کی بجائے نانگا پیر چوٹی کی طرف انکو اشارہ کیا کہ جناب اس چوٹی سے میں آتا ہوں۔جب یہاں پہنچتا ہوں تو میرا پورا جسم درد کرتا ہے اور پھر شام کو دوبارہ گھر کی طرف سفر کرتا ہوں۔میں اگر اور ورزش کروں گا تو چند ماہ میں ہسپتال پہنچ جاؤنگا۔ورزش وہ لوگ کرتے ہیں جو سست ہوں۔میں صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے اٹھتا ہوں۔پھر سورج کی پہلی کرن پہاڑی پر پڑتی ہے تو میں گھر سے روانہ ہوتا ہوں۔میری رام کہانی سن کر انکا دل موم ہو گیا۔آنکھیں نم ہو گئیں۔کہنے لگے دنیا سدھر گئی مگر ہمارا کشمیر وہاں کا وہاں ہی رہ گیا۔پھر میں نے ایک پہاڑی کا نقشہ کھینچا اور ان سے کہا کہ کسی دن آپ چلیں۔آپ کی سیر کرواتا ہوں۔انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگائے اور اسکے بعد میں ورزش کی کلاس سے الگ کر دیا گیا۔ان سب رام کہانیوں کے بارے میں میرے کزن راجہ عبدالقدیر کے علاوہ کسی کو علم نہیں تھا۔وہ آج اپنے بچوں کو میری کہانیاں سنا سنا کر میرا مذاق اڑاتے ہیں۔اور بچے ہنستے ہیں۔انکل حبیبی (Uncle Habibi) آپ تو واقعی چھپے رستم نکلے۔

آدھا کپ چائے والا: اُس دور میں چائے کا یک کپ غالباً ایک آنہ میں پڑتا تھا۔اور وہ بھی میرے پاس نہ تھے۔صبح ہم سب کھانا گھر سے کھا کر آتے۔میرے کزن قدیر کے والد راجہ محمد خان صاحب امریکہ میں ہوتے تھے۔اسلئے انکو خاصا پاکٹ خرچ ملتا تھا۔مگر میں نے ان سے چائے نہ لینے کا فیصلہ کیا۔حالانکہ ان کی والدہ صاحبہ جو میری پھوپھی تھیں انہوں نے خصوصی طور پر الاؤنس بڑھا دیا تھا۔تا کہ مجھے چائے اور لنچ کے دوران مشکل پیش نہ آئے۔ہمارے گاؤں کُرتی کی راجہ میر عالم خان بڑے اچھے اور نیک انسان تھے۔چائے کا ریسٹورانٹ انکا تھا۔اور انکے بیٹے انکے ساتھ کام کرتے تھے۔میرا بجٹ نہ ہونے کے برابر تھا۔مگر صبح کھانا کھا کر آتا تھا۔اسلئے صرف چائے کی ضرورت تھی۔اب میں نے پچا میر

عالم خانصاحب سے سودہ کیا کہ میں آپکو آدھا کپ چائے کے پیسے دونگا۔ کیونکہ میرے پاس صرف آدھا کپ چائے کے پیسے ہی روزانہ کیلئے ہوتے ہیں۔ موصوف راضی ہو گئے۔ چنانچہ ہر روز بارہ بجے چچا میر عالم خان پوچھتے'' آدھا کپ'' اور میں کہتا ''جی'' اور یوں وہ پورا کپ چائے کا دیتے مگر چارج آدھا کپ کا کرتے اور یہ سلسلہ دو سال تک جاری رہا۔ اسکے بعد میرا نام آدھا کپ چائے والا پڑ گیا۔ اور کینیڈا سے واپسی تک وہ مجھے آدھا کپ والا ہی کہتے رہے اور میری کہانی سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ مگر میں نے ان سے انصاف ضرور کیا۔ اور جب میں باغ کالج گیا اور شہرت کی بلندیوں پر پہنچا تو اکثر سیاسی راہنماؤں کے ہمراہ ملوٹ کا دورہ کرتا۔ اور ان سے رقم کی ادائیگی کرواتا۔ مگر موصوف پھر بھی کہتے تمہارا کپ آدھا چارج کیا ہے۔ اور ہم دونوں خوب محظوظ ہوتے۔ اور جب میں چلا جاتا تو باقی گاہکوں کے ساتھ اس بات کا خاص طور پر ذکر کرتے۔ ہائی سکول کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں نے باغ کا سفر کیا۔ باغ کالج میں داخلہ لیا۔ اس دور میں گویا بیرون ملک تعلیم کیلئے جانے کے برابر تھا۔ میرے تایا فوجی تھے۔ حوالدار میجر ریٹائر ہوئے تھیا نکا کہنا تھا کہ کہیں استاد لگ جاؤ اور ملازمت کرو۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔۔ اور آخر کار میری والدہ نے فیصلہ کیا کہ میں باغ جاؤنگا۔ باغ کا سفر تین گھنٹ کا پیدل سفر تھا۔ ظاہر ہے مجھے باغ شہر میں رہنا پڑے گا۔ میرے کزن راجہ عبدالرزاق خان اس وقت فائنل ایر میں تھے۔ وہاں چارپائی لگوائی گئی۔ یہ بلڈنگ فارسٹر گل احمد صاحب کی تھی۔ انکے فرزند راجہ محمد حیات خان بھی وہاں ایف اے کے طالبعلم تھے۔ فارسٹر صاحب نے والدہ محترمہ کو بتایا کہ کوئی بات نہیں بچے کو بھیج دو۔ اخراجات کا یہ خود بندوبست کر دیگا۔ انہیں علم تھا کہ میں سیاسی چالبازیوں کا ماہر ہوں۔ گاؤں جھڑ میں پیدا ہونیوالا کہیں بھی مار نہیں کھا سکتا۔ یہ انکا فرمان تھا۔ انکا کہنا تھا کہ یہ گاؤں شریفوں کے ساتھ ساتھ حد سے زیادہ شاطروں اور قاتلوں کی سرزمین ہے۔ انہیں سارے حالات کا علم تھا۔ اور وہ اکثر ہنسی مذاق میں پرانی کہانیوں کو دہرایا کرتے تھے۔ ۱۹۷۰ء کے دوران باغ شہر میں جن افراد کو سب سے زیادہ شہرت حاصل تھی۔ انمیں زیادہ تر امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی مرحوم کے کارکن تھے۔ جنمیں سردار محمد حسین دھڑے، مُلاّ غلام، سیّد حسن شاہ گردیزی، راجہ اکبر منہاس۔ مولانا محمد اکبر خان آف آوہڑہ اور ملاّاں میر صاحب آف بدر مشہور تھے۔ راجہ صدیق خان آف کفل گڑھ کا کلاتھ سٹور تھا جہاں اکثر نارمہ برادی کے لوگ جمع ہوتے تھے۔ اور علماءِ کرام میں استادالاساتذہ مفتی امیر عالم خان کو بہت ہی عزت و احترام حاصل تھا۔ اور نعمان پورہ قاسم العلوم کے منتظم مولان امیرالزماں خاصے مشہور تھ۔ منہاس بلڈنگ پہلی بلڈنگ تھی جو خاصی مشہور تھی۔ ملایال برادری میں سردار محمد یوسفصاحب۔ انکے بھائی حاجی زمان دوکاندار اور بعدازاں میجر ایوب خان خاصے مشہور ہوئے۔ وقت تیزی سے گذرنے لگا۔ مگر جلد ہی راجہ عبدالرزاق خان مانٹریال روانہ ہو گئے اور میں اکیلا رہ گیا۔ کمرہ تبدیل کر کے منہاس بلڈنگ میں لیا۔ وہاں کرایہ کچھ زیادہ تھا وہاں سے تعلیم القران کے سامنے منظور بلڈنگ میں لیا۔ اسی دوران اسلامی جمیعت طلبا کی تنظیم قائم کی اور پہلا ناظم بنا۔ اسلامی جمیعت کے ناظم اعلیٰ ظفر جمال بلوچ کو باغ میں دعوت دی۔ اور گیسٹ ہاؤس میں پہلا اجتماع ہوا۔ میرے ممبران میں ابتدائی طور پر سار فندل اور بھٹی کے چند طالبعلم تھے۔ چھتر سے عبدالرشید ترالی صاحب پہلے ممبر بنے اور اسکا باقاعدہ دفتر قائم کیا گیا۔ جس کا افتتاح اس وقت کے صدر سردار عبدالقیوم خانصاحب نے کیا۔ اس دوران راجہ محمد یونس طاہر وکالت کیلئے میدان میں اترے اور راجہ سبیل خان وکیل کی حیثیت سے سامنے آئے۔ راجہ رفیق خان اور مولانا عبدالقدوس صاحب اپنی

دو کانوں پر کام کرتے تھے۔

گرمیوں میں میں اکثر کلاس میں نہ جاتا بلکہ سیدھا سدھن گلی کا رخ کرتا۔ کچھ دیر گنگا چوٹی سے کشمیر کے نظارے دیکھتا۔ گنگا چوٹی سے دور تک مقبوضہ کشمیر کا علاقہ دیکھتا۔ ایک دوربین تھی جو سارے نظارے دیکھنے کے کام آتی۔ وہاں سے آہستہ آہستہ سیدھا نانگا پیر پہنچتا۔ اور ایک گھنٹہ وہاں بیٹھا رہتا۔ ظاہر ہے جنگل سے گذرتے ہوئے مجھے اپنی حفاظت کرنی تھی اسلئے ایک پستول اپنے پاس رکھتا۔ شام کو نانگا پیر سے گلیاں نامی جگہ سے گذر کر نیچے کی طرف دوڑ لگاتا۔ اور آدھے گھنٹے میں جلالیاں پہنچ جاتا۔ جہاں ہمارے گاؤں کے نزدیکی چچا محمد غلام کا گھر تھا۔ انکو سلام کر کے سیدھا گھر پہنچتا۔ کسی سے کبھی ذکر نہ کرتا کہ میں کتنا لمبا سفر کر کے آیا ہوں۔ گنگا چوٹی سے نانگا پیر کا سفر میرے لئے جنت سے کم نہ تھا۔ خوبصورت نظارے، خوبصورت جنگل اور ہر طرح کے پرندوں کی آوازیں اور جنگلی پھول۔ ایسا لگتا تھا کہ میں جنت میں ہوں۔ ہوا تروتازہ، نہ شور شرابہ۔ سوائے پرندوں کی آواز کے کوئی آواز سنائی نہ دیتی۔ اگر رات کو جنگلی جانوروں کا خوف نہ ہوتا تو میں چادر بچھا کر وہاں ہی سو جاتا۔۔ میرے پاس ایک بیگ ہوتا تھا۔ اسمیں ایک درجن گولیاں، پستول۔ ایک بڑی چادر ہوتی تھی۔ میرے بال ویسے بھی لمبے ہوتے تھے۔ چادر اوڑھ کر بالکل سادھو لگتا تھا۔ کبھی کبھار کوئی راستے سے گذرتا تو سلام بولتا۔ اور بڑے غور سے دیکھ کر گذرتا کہ لڑکا یہاں کیا کر رہا ہے۔ کبھی ہمارے گاؤں کے لوگ باکریاں نامی دیہات میں رہتے تھے جو کوٹ گوجراں کے ساتھ تھا۔ راجہ سیدا کبر خان نامی ہمارے گاؤں کے بہت ہی مذاحیہ انسان تھے۔ میرے والد کے قریبی دوست تھے۔ انکے گھر بن بہک میں بھی ہوتا تھا۔ میں کبھی انکی طرف چلا جاتا۔ رات وہاں گذار کر صبح نڑی کے راستے گھر پہنچتا۔ ایک دقعہ میں نانگا پیر سے تھوڑا آگے سری چلا گیا۔ یہ کھلا میدان ہے۔ جہاں جانوروں کی چراگاہیں بھی تھیں۔ میں درمیان میں بیٹھ گیا۔ ابھی میں بیٹھا ہوا تھا کہ راجہ سید اکبر خان آف بکریال وہاں پہنچ گئے۔ وہ چکار کسی کام سے گئے ہوئے تھے۔ اس علاقے کی با اثر شخصیّت تھے۔ لوگ انکو ایک خطرناک شخص قرار دیتے تھے۔ مگر میں نے انکو زندگی میں کبھی کسی کے ساتھ زیادتی کرتے نہیں دیکھا۔ مجھے دیکھ کر حیران رہ گئے۔ حبیب یہاں کیا کر رہے ہو۔ میں نے انہیں بتایا کہ کالج سے گھر جا رہا تھا۔ خاصا وقت تھا۔ میں نے سوچا سری کا دورہ کرلوں۔ وہ بھی بیٹھ گئے۔ اتنے میں ایک انتہائی پہلوان نما شخص نمودار ہوا۔ بڑی بڑی موچھیں اور ڈنڈا ہاتھ میں لئے تھا۔ اسکو دیکھ کر کہنے لگے۔ آئیندہ کبھی اس طرف نہ آنا۔ خوش لباس سمجھ کر کوئی بھی تمہیں جان سے مار سکتا ہے۔ میں نے ان سے کہا راجہ صاحب جو سنسان جگہوں پر آنا پسند کرتے ہیں وہ اپنا دفاع بھی کر سکتے ہیں۔ میں نے فوراً اس آدمی کو بلایا۔ پوچھا کہاں جا رہے ہو۔ کہنے لگا، سدھن گلی کسی کام سے جا رہا ہوں۔ میں نے اس سے فوراً کھڑے ہو کر کہا تمہیں پتہ ہے کہ یہاں راجہ آف نانگا پیر کی اجازت لئے بغیر گذرنے کی اجازت نہیں ہے۔ پوچھا کون ہے۔ میں نے بتایا کہ میں ہوں۔ غصے میں اسے بولا جو کچھ پاس ہے میرے حوالے کر دو۔ فوراً بٹوہ نکالا۔ پھر گھڑی لی اور پھر جوتے دیکھ کر اس سے کہا کہ یہ جوتے بہت اچھے ہیں وہ بھی اتارو۔ اس نے فوراً اتارے۔ اس دوران راجہ سیدا کبر صاحب کا چہرہ سرخ ہو چکا تھا۔ مگر وہ ہنسی پر کنٹرول کر رہے تھے۔ خیر میں نے رقم اور جوتے اس کے حوالے کئے اور اسکو کہا کہ اگر دل اتنا نہ ہو تو ایسی سنسان جگہوں سے اکیلے نہ گذرا کرو۔ اور اسے کہا اب راجہ آف نانگا پیر کی طرف سے تمہیں اجازت ہے۔ جہاں چاہو جا سکتے ہو۔ شکریہ ادا کیا۔ بٹوہ لیکر بوٹ ہاتھ میں لیکر بھاگا۔ سیدا کبر خانصاحب اتنے

ہنسے کہ زندگی بھر جب بھی ملتے تو وہ باتیں یاد رہتین ۔ کہنے لگے واقعی حبیب جن لوگوں میں جراءت ہو وہ کسی سے نہیں ڈرتے ۔اسکا ذکر انہوں نے والد صاحب کے علاوہ اور کسی سے نہ کیا۔ یوں ہماری یہ بات صیغہ راز میں رہی۔

اکثر ہمارے گاؤں جھڑ کو خطرناک گاؤں قرار دیا جاتا تھا۔ جب میں نے اس بات کا ذکر والد صاحب سے کیا تو انہوں نے ساری کہانیاں سامنے رکھ دیں۔ بولے یہاں قتل کرنا اور دبا دینا۔ یہ عام رواج ہے۔ پھر کچھ سالوں بعد بدلہ لیا جائیگا سارے کام خاموشی سے ہوتے ہیں۔ پولیس کے پاس جانے کا رواج نہیں۔ خاموشی سے معاملات طے کر دیئے جاتے ہیں۔ اکثر وراثت کے معاملے میں وارث زمین کا اکیلا فرد ہو تو اسکو زہر دیکر مار دیا جاتا ہے۔ اور یوں ساری زمین ہڑپ کر لی جاتی ہے۔ اس قسم کے واقعات عام ہوتے تھے۔ بچیوں کو وراثت میں حصہ دینے کا رواج نہیں تھا۔ بچی یتیم ہو جائے تو اسے جلدی میں شادی کروادی جاتی تھیں ۔اور اگر رشتہ داروں کو خطرہ ہو کہ بعد میں زمین سے جائیں گے تو اس کو راستے سے بھی ہٹایا جاسکتا ہے۔۔ اسی لئے میرے والد اکثر میری والدہ کو کہتے تھے کہ اپنے باپ کی زمین کا نام نہ لینا، وہ لوگ نمازیں پڑھتے ہیں مگر یتیموں کا حق بھی مارتے ہیں اور میں گھر نہیں ہوتا۔ وہ بچوں کو مار ڈالیں گے۔ خصوصاً حبیب کو نشانہ بنائیں گے۔ خیر اس سلسلے میں میرے دور میں سب سے اہم واردات پس جھونہ میں ہوئی تھی۔ جہاں ہمارے گاؤں کی ایک خاتون اور اس گاؤں کے لڑکے کو قتل کر دیا گیا تھا۔ لڑکی شادی شدہ تھی۔ اطلاعات کے مطابق یہ فیصلہ باقاعدہ گاؤں کے سرپرستوں کی اجازت سے کیا گیا تھا۔ اور انکو ساری صورت حال کا علم تھا۔ اسوقت میں ملوٹ ہائی سکول میں تھا۔ جب یہ حادثہ پیش آیا۔ صبح صبح جب گاؤں کے ایک اہم شخص گذرے تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا خبر۔ کہنے لگے ایک لڑکی بھاگ گئی تھی۔ بس اب ظاہر ہے، لگتا یہی ہے کہ دونوں قتل ہو گئے ہیں۔ انکو علم تھا۔ پولیس پہنچ گئی۔ سارے افراد گرفتار ہو گئے۔ مگر لڑکی کا خاوند چونکہ راولپنڈی چلا گیا تھا اور اسکے پاس بس ٹکٹ بھی تھا۔ اسلئے وہ موقع واردات کے وقت عدم موجودگی ثابت کر چکا تھا۔ اسکو رہا کر دیا گیا۔ اور وہ پاکستان چلا گیا۔

چند سال بعد میں شام کے وقت گاؤں پہنچا اور بن بہک کا رخ کر رہا تھا۔ اب رات ہونے والی تھی۔ میں نے چچا شیر احمد خان ایک بزرگ جو فارسٹر گل احمد صاحب کے بڑے بھائی تھے۔ انکو آواز دی اور ان سے کہا کہ کوئی سوٹی دے دیں۔ راستے میں کام آئیگی۔ انہوں نے پائپ نما لوہے کا ڈنڈا ہاتھ میں پکڑا دیا۔ یہ لے جاؤ، صبح واپس دے جانا۔ میں چلا گیا۔ اس دوران مجھے احساس ہوا کہ انکے گھر کے اندر تین چار آدمی بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک کی آواز میں پہچان سکتا تھا۔ میں نے جاتے جاتے ان سے پوچھ لیا۔ کہنے لگے۔ جی ہاں۔ چند آدمی آئے ہیں۔ چائے بنا رہا ہوں۔ وہ اکیلے رہتے تھے۔ صبح سویرے میں جب پہنچا تو چچا شیر احمد صاحب گھر کے باہر پڑے ہوئے تھے۔ اور گاؤں کے معززین منہ سے گھاس پوس نکال رہے تھے۔ ایسا لگتا تھا کہ انکو مارا گیا ہے۔ میں وہاں پہنچا تو میں نے اس زیادتی پر احتجاج کیا۔ بزرگ لوگ کہنے لگے کہ لگتا ہے دل کا دورہ پڑا ہے۔ بس زندگی اتنی ہی تھی۔ میں نہیں مانا، میں نے کہا حضرت عزرائیل کو بلالی (چاولوں) کے خشک پودے اور گھاس منہ میں ڈال کر انکو اگلے جہاں لے جانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ قتل ہے اور پولیس کو اسکی اطلاع دے دینی چاہیئے ۔ اتنے میں انکے بھائی فارسٹر گل احمد خان آ گئے ۔ انہوں نے مجھے الگ لیجا کر کہا کہ حبیب میں آج اپنے بھائی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں ڈالونگا۔ مگر پورا گاؤں گواہ بن گیا ہے کہ انکی موت اچانک ہوئی ہے۔ بیکار میں پورا گاؤں پولیس کی آمدنی

کا ذریعہ بنے گا اور یہ لوگ پھر بری ہو جائیں گے۔ معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ اور مجھے کہا گیا کہ ابھی کالج میں ہو۔ زندگی تمہارے سامنے ہے۔ بچ کر رہو۔ جب انکا بھائی کہہ رہا تھا تو میرے لئے خاموشی کے علاوہ کوئی چارہ کار نہ تھا۔

ہمارے گاؤں میں صرف پرائمری سکول تھا۔ جسے مڈل کا درجہ دیا گیا۔۔ مڈل سکول تھوب میں تھا۔ جب لڑکیوں کی تعلیم کا مسئلہ سامنے آیا تو میں نے اعلان کر دیا کہ میری بہن تو سکول جائیگی۔ تایا صاحب نے صاف انکار کر دیا۔ ہمار گھر سے کوئی لڑکی سکول میں نہیں جائیگی۔ یہ گھر میں جو کچھ پڑھ سکتی ہیں، پڑھیں۔ ساری کوششوں کے باوجود میں اپنی کزن کو پڑھائی پر تیار نہ کر سکا۔ مگر میں نے اپنی دونوں بہنوں مصوّر بیگم اور آثار بیگم کو سکول میں داخل کروا دیا۔ میرے تایا کہنے لگے یہ بڑی ہو کر لڑکوں کو خط لکھیں گی۔ میں نے کہا اگر انکو پسند آ گیا کوئی ایسا لڑکا تو لکھنے دیں۔ اسلئے ہم انکو تعلیم سے محروم کیسے کر سکتے ہیں۔۔ میں نے حکم عدولی کی۔ انکو علم تھا کہ میں سننے والا نہیں۔ اسلئے خاموش ہو گئے۔ بعد ازاں جب ہائی سکول کا وقت آیا تو انکو تھوب ہائی سکول میں داخل کروایا۔ سب نے مخالفت کی کہ ہم وہاں داخل نہیں کروائیں گے مگر میں نہ مانا۔ میرے تھوب میں خاصے قریبی دوست تھے۔ انہوں نے بچوں کی صحیح نگہداشت کی۔ مقامی عداوتوں کی وجہ سے لوگوں کی تقسیم کا سلسلہ جاری ہے۔ ہم اپنے ہی تھکیال راجپوت خاندان کے سکول میں داخلہ کے لئے تیار نہ تھے۔۔ اس وجہ سے دونوں قبائل میں خاصی دوستی بڑھی۔ اور میری شادی میں تھوب برادری کی بڑی تعداد شرکت کیلئے آئی۔ کچھ ی عرصہ بعد میری درخواست پر راجہ محمد سبیل خان صاحب مرحوم نے گرل پرائمری سکول کی منظوری دلوائی۔ میں اور فارسٹر گل احمد خان مرحوم نانگا پیر کے راستے چکار پہنچے اور وہاں سے بس کی چھت پر بیٹھ کر مظفرا آباد پہنچے۔ انکو دمہ کی مرض تھی اور سخت ہوا کی وجہ سے انکی سانس بند ہونے لگی تو بس رکوانی پڑی اور انکو اندسیٹ دلوائی گئی۔ اس دوران ہم نے کوٹ گوجراں میں پرائمری سکول کی بھی منظوری دلوائی۔ جس کا وعدہ الیکشن کے دوران ہم نے وہاں کے لوگوں سے کیا تھا۔ اور یوں پرائمری سکول کی بنیاد گاؤں میں خالصہ سرکار میں کیا گیا جو اب مڈل سکول ہے۔

باغ میں ایف ۔اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں کراچی چلا آیا۔ آگے بی۔اے کی تعلیم کیلئے ڈگری کالج کی ضرورت تھی۔ سوچا وہاں ملازمت لے لوں گا اور نائٹ کالج میں آگے پڑھوں گا۔ ایک ماہ بعد خط آیا کی باغ ڈگری کالج ہو گیا ہے۔ سارے معززین نے مطالبہ کیا کہ میں واپس آ جاؤں۔ پھر وہاں سے واپسی کا پروگرام بنایا۔ یوں باغ ایک مرتبہ میری زندگی کا مرکز بن گیا۔ پرنسپل شبیر احمد طاہری تھے جو لادینی نظریات کے مالک تھے۔ مگر پروفیسر حضرات میں عبدالحق صاحب ملوٹ سے تھے اور پروفیسر سیّد ضمیر حسین شاہ صاحب اکنامکس پڑھاتے تھے۔ ان کے کہنے پر میں نے پاکستان کے معاشی مسائل پر ایک مضمون لکھا۔ جسے قائداعظم یونیورسٹی کے مقابلہ میں فرسٹ پرائز ملا۔ اور یہ غالباً تین ہزار روپے کی رقم تھی جو میرے کام آئی۔ میں اسلامی جمعیت طلباء کا ناظم بی۔اے سے فراغت تک رہا۔ اس دوران میجر ایوب صاحب کی قرارداد ختم، نبوت کے حق میں میرا پہلا جلوس باغ کا سب سے بڑا جلوس تھا جو جمعیت کے پلیٹ فارم سے نکالا گیا۔ جس سے سردار محمد حسین دحڑے اور دیگر عمائدین نے بھی خطاب کیا۔ اس دوران راقم نے امیر شریعت کی جدوجہد کے بارے میں ایک تفصیلی انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا اور مختلف رسالوں میں شائع کروانے کی کوشش کی۔ صرف ہفت روزہ کشمیر نے مضمون کو کھلے عام شائع کیا۔ جس کی

وجہ سے موصوف کو شائید سردار عبدالقیوم صاحب سے اچھے تعلقات کی قربانی دینی پڑی۔ اسکا ذکر موصوف نے ایک بار کیا۔ مگر موصوف نے تحریک آزادی کے بارے میں بعدازاں بھی میرے مضامین تسلسل کے ساتھ شائع کئے۔ اس دوران میرے ریسرچ ورک پر دھمکیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اور بعض سیاستدانوں نے واضح کیا کہ اس مسئلے میں آگے بڑھو گے تو کالج سے نکالے جاؤ گے۔ یونین کے الیکشن مہم میں کالج کی حدود میں مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ حملہ آوروں نے مجھے قتل کرنے کے مکمل انتظامات کر دیئے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو میری زندگی منظور تھی۔ مجھے جلدی باغ ہسپتال میں داخل کروا دیا گیا۔ میرے سر پر خاصے ٹانکے لگے اور زخم بند کرنے کی کوشش کی گئی۔ میرے کلاس فیلو راجہ انور صاحب آف غنی آباد اس وقت باغ ملٹری ہسپتال میں نرسنگ کے شعبہ سے تھے۔ یہ کام انہوں نے سرانجام دیا۔ کہنے لگ بچ گئے ہو۔ مگر اب کسی طرح تعلیم مکمل کرلو۔ اور اس جگہ سے چلے جاؤ۔ یہ درندوں کی سرزمین ہے۔ یہاں لیڈر حضرات دولت اور طاقت کیلئے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اس دوران صوبیدار علی اکبر خان المعروف پول صاحب کچھ آدمیوں کو لیکر آ گئے۔ اور اعلان کر دیا کہ ہم اس پورے باغ شہر کو آگ لگا دیں گے۔ ہمارے بچے پر حملہ ہوا ہے۔ ہم برداشت نہیں کریں گے۔ صورت حال سنگین تر ہو گئی۔ کالج بند کر دیا گیا۔ اس قسم کے قاتلانہ حملے کی تیاریاں اکثر ہوتی رہتی تھیں۔ مگر اس دفعہ ہنگامہ آرائی کے موقع پر یہ لوگ آگے بڑھے۔ یہ بات بھی حیران کن ہے کہ میرے وہ دوست جنکا تعلق کفل گڑھ سے تھا۔ موقع سے غائب ہو گئے۔ اور دیگر دوستوں نے مدد کی۔ انمیں چند نوجوان دوسرے گاؤں کے تھے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ یہاں تو حکومت کے سرپرست کسی کی آواز کو دبا سکتے ہیں۔ وجہ صاف ظاہر ہے۔ وہ اپنی کرپشن اور چوری کھلے عام برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اور اسکا کچھ حصہ مقامی کارکنوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ اور غریب عوام اسی طرح غربت کی زندگی گذارنے پر مجبور تھے۔ مولانا امیر الزماں ملنے آئے اور کہا بیٹا! یہاں سے چلے جاؤ۔ چند دن بعد آؤ۔ یہ تمہیں کالج سے نکالنے کا پلان بنا چکے ہیں۔ پھر ایک سیاسی راہنما آزاد کشمیر کے ایک لیڈر کا پیغام لائے۔ میں نے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور شام کے وقت نعمان پورہ آ گیا۔ اور وہاں سے سیدھا گھر پہنچا۔ چند دن قیام کیا۔ سر کی پٹیاں کھولی گئیں تو ڈاکٹر نے مکمل اطمینان کا اظہار کیا۔ اور ایک ہفتےبعد پرنسپل کے آفس میں تھا۔ پرنسپل صاحب فرمانے لگے۔ خاموشی سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرو اور چند تحریریں دکھائیں جو وزیرِ تعلیم کی طرف سے تھیں۔ میں نے انکا شکریہ ادا کیا اور اپنے کام میں مشغول ہو گیا۔

باغ شہر کافی مہنگا تھا۔ جب میں نے بی۔ اے کا داخلہ لیا تو باغ میں میرے اخراجات پورے نہ ہو سکتے تھے۔ اور مجھے ویسے بھی شہر سے باہر رہنا تھا۔ تاکہ تعلیم مکمل کرسکوں۔ نعمان پورہ نسبتاً خاموش علاقہ تھا اور ساتھ ہی یہاں ہمارے گاؤں کے راجہ سید عالم خانصاحب کا ریٹورنٹ تھا جو ہمارے ہمسایہ تھے۔ اب مشکل یہ تھی کہ کہاں رہا جائے۔ مجھے اپنا کمرہ چاہیئے تھا۔ ہمارے علاقے کے سارے طلبعلم راجہ سید اکبر خان دوکاندار کی عمارات کے اوپر منزل میں رہتے تھے۔ ایک دن میں نے معائینہ کیا تو یونین کونسل کا دفتر خالی تھا۔ یونین کونسل کے چیئرمین غالباً راجہ سید اکبر خان تھے یا ممبر تھے۔ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ یہ تین کمروں پر مشتمل خاصی بڑی عمارت ہے، خالی پڑی ہے۔ میں کیوں نہ وہاں رہائیش اختیار کرلوں۔ کہنے لگے۔ سرکاری عمارت ہے۔ ہمت ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ میں نے چچا سیّد عالم سے ہتھوڑا لیا۔ تالا توڑا اور اپنی چارپائی وہاں لگا دی اور بستر لگا کر سو گیا۔ ساری کتابیں منتقل کیں۔ فرنیچر تو سارا سرکاری

تھا۔ کرسیاں اور میز۔ اچھا خاصا آفس تھا۔ دوسرے دن میں بگلہ کے راجہ زرین جن کے پاس جگہ نہیں تھی، انکو بھی شامل کر دیا۔ پٹواری منشی رفیق کبھی کبھار وہاں آیا کرتے تھے۔ وہاں پر کافی بسترے پڑے تھے۔ پتہ چلا کہ یہ ۱۹۷۱ء انڈیا پاکستان جنگ کے دوران المجاہد فورس کیلئے اکٹھے کئے گئے تھے۔ اب فورس ہوتی تو بسترے استعمال کرتی جو سردار عبدالقیوم صاحب نعروں کیلئے استعمال میں لاتے تھے۔ اور باہر سے کروڑوں کے چندے وصول کرتے تھے۔ میں نے فوری طور پر ان بستروں کا انتظام کیا۔ کچھ تو مدرسہ قاسم العلوم کے حوالے کئے جو سب نئے تھے۔ اور کچھ اپنے ساتھیوں کے حوالے کئے۔ جنکے گھر میں بسترے نہیں تھے۔ مندری کے پٹواری راجہ روشن خانصاحب کو علم ہوا تو بہت غصے ہوئے۔ کہنے لگے یار جالب تم بھی کمال کرتے ہو۔ یہ سرکاری مال تھا۔ منشی گلزار صاحب نے کہا کہ مجھے تحصیلدار کو رپورٹ کرنی پڑے گی۔ کیونکہ یہ سرکاری مال تھا۔ میں نے کہا سرکاری مال کدھر سے آ گیا۔ یہ ہمارے ان لوگوں کے نئے بسترے اور کمبل تھے۔ بہرحال ہفتے بعد پولیس کا ایک سپاہی میرے پاس آیا اور کہا کہ تحصیلدار نے تمہیں طلب کیا ہے۔ تحصیلدار کے سامنے حاضر ہوا تو میں نے انکو بتایا کہ بسترے جو عام لوگوں کے تھے وہ مدرسہ کو دیئے ہیں۔ نیکی کا کام تھا۔ رہا سوال یونین کونسل کے دفتر کا تو یہ خالی ہے اور کسی کے استعمال میں نہیں ہے۔ میں رہ رہا ہون۔ چند ماہ میں خالی ہو جائیگا۔ بی۔ اے کا امتحان دینے کے بعد میں نے کونسا وہاں رہنا ہے۔ اور آپ ہمارے مولانا امیر الزماں خانصاحب کو تو جانتے ہونگے۔ انہوں نے کراچی میں پاکستان کے ایک وزیر خارجہ کے سر پر ڈنڈا دے مارا تھا۔ تو آپ کیلئے بھی یہاں ملازمت کرنا مشکل ہو جائیگا۔ آپ وہاں سے ہی گذر کر آگے جاتے ہیں۔ قاضی صاحب غالباً میرپور کے رہنے والے تھے۔ خاموش ہو گئے۔ کہنے لگے جب وہاں سے دفتر چھوڑو تو مجھے مطلع کر دینا۔ اور یوں معاملہ رفع دفع کر دیا گیا۔ مولانا صاحب کو پتہ چلا تو وہ سخت غصے ہوئے۔ کہنے لگے۔ کسی ہمت نہیں کہ چوریاں بھی کرے اور سینہ زاریاں بھی کرے۔ وہ سردار عبدالقیوم خان حکومت کی کرپشن سے واقف تھے۔ انکی انتہائی کوشش کے باوجود بنی پساری تھوب روڈ پر سردار صاحب فنڈز دینے کو تیار نہ تھے۔

بعدازاں جب جنرل محمد حیات خانصاحب کی انقلابی حکومت آئی جس نے تاریخ میں سب سے بڑا ترقیاتی کام کیا تو لوگوں کو علم ہوا کہ وہ جن لوگوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے۔ وہ کتنے بڑے چور تھے۔ باغ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے والے ہم تین طالبعلم تھے۔ یہ کالج کا پہلا امتحان تھا۔ رزلٹ افسوس ناک تھا۔ میں نے پولیس میں بھرتی ہونے کی بجائے لاہور کا رخ کیا۔ جس کا راجہ سبیل مرحوم کو سخت صدمہ ہوا۔ مگر میں نے خان عبدالحمید خانصاحب کے اس دور میں صدر آزاد کشمیر سردار ابراہیم صاحب کے کہنے پر عمل کیا۔ جنکا انٹرویو میں نے لیا تھا۔ گو موصوف نے میری تقرری کروا دی تھی۔ مگر مجھے لاء کرنے کا شوق تھا۔ اور اس سلسلے میں مولانا محمد اکبر خان اور راجہ یونس طاہر صاحب کی بھی خواہش تھی۔ اسلئے میں نے بغیر کسی منصوبہ بندی کے ایک دن لاہور کا رخ کیا۔ وہاں اپنے رشتہ دار حافظ محمد اکرم صاحب کے ہاں قیام کیا۔ اور اسلامیہ لاء کالج کچہری روڈ میں داخلہ لے لیا۔ جلد ہی اس کالج کو یونیورسٹی ؤف پنجاب نے اپنی تحویل میں لے لیا۔ اس کالج میں کچھ عرصہ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ اور پھر کالج اولڈ کیمپس میں منتقل کر دیا گیا۔ جس کے پرنسپل سردار اقبال مئوکل تھے۔ پارٹ ٹائم پروفیسرز حضرات میں ایم۔ انور بار ایٹ لاء، مس انجیلا مارکس میرے پسندیدہ پرفیسر تھے۔ تعلیم کا سلسلہ جاری رہا۔ گو اب یونیورسٹی کے اخراجات حد سے زیادہ تھے۔ کتابوں کے علاوہ فیس اور دیگر اخراجات کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔ سب نے کہا کہ کینیڈا

اپنے رشتہ داروں سے رابطہ قائم کریں مگر میں نے انکار کردیا۔ چند وکلاء کے دفاتر میں پارٹ ٹائم کام کرتا رہا۔بعض دوست احباب باغ سے مدد کرتے رہے۔جنمیں مولانا محمد اکبر صاحب شامل تھے۔ جنکا ہر وقت شکریہ ادا کرتا رہا۔

یونیورسٹی کے شب وروز گذرتے رہے۔لاہور میں دہلی مسلم ہوٹل آزاد کشمیر کے لوگوں کا مرکز تھا۔ یہاں سردار عالم خان نامی ایک مشہور شخصیت تھے۔ یہاں اکثر آزاد کشمیر اور مہاجرین جمّوں وکشمیر کے لیڈران آیا کرتے تھے۔اسی دوران میں نے شیخ منظر مسعود کو دیکھا جو مسلم کانفرنس کے دور حکومت میں نائب صدر تھت۔ جب حکومت آزاد کشمیر نے کالج میں ملیشیا کی شلوار قمیض کو سرکاری لباس قرار دیا۔اور اس وقت آزاد کشمیر کے صدر سرکاری خرچ پر عیّاشی کیلئے غیر ملکی دورے پر تھے۔اور شیخ صاحب نائب صدر تھے اور باغ کالج میں ایک اجتماع کی صدارت کرنے آئے۔ بدقسمتی سے میرے پاس ملیشیا کی شلوار قمیض نہیں تھی۔میں سوٹ پہن کر آگیا۔جو چند ہی ہفتے قبل کینیڈا سے رشتہ داروں نے بھیجا تھا۔ظاہر ہے شیخ صاحب شلوار قمیض اور شیروانی پہنے ہوئے تھے۔جونہی مجھے دیکھا تو فرمایا۔ یہاں ایک لڑکا احساسِ کمتری میں مبتلا ہے۔سوٹ پہننے سے کوئی بڑا آدمی نہیں بنتا۔آج وہی شیخ صاحب سوٹ میں ملبوس تھے۔اور میں شلوار قمیض میں تھا۔ان سے ہاتھ ملایا۔اور یاد دلایا کہ میں وہی باغ کالج کا طالبعلم ہوں جس کے سوٹ کو دیکھ کر آپکی قوت برداشت جواب دے گئی تھی۔موصوف انتہائی شرمندہ ہوئے۔اور خاموشی سے دوسری طرف چلے گئے۔میں نے جواب دینا تھا جو دے دیا۔سیاست دان جب حکومت میں ہوتے ہیں تو منافقت کی انتہا پر چلے جاتے ہیں۔انکی اندر کی کہانی اور ہوتی ہے اور عوامی چہرہ اور ہوتا ہے۔

یونیورسٹی میں ابتدائی تعلیم کے دوران میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں یہاں مقامی سیاست میں حصہ نہیں لونگا۔ اور جمیعت اور این۔ ایس۔ ایف کے درمیان حالات جنگ اور دوسری تنظیمیں جنمیں پی۔ایس۔ایف شامل تھی۔آئے روز تصادم رہتا تھا۔میں نے خاموشی سے کشمیر ستوڈینٹس ویلفیئر ایسوسی ایشن پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ شمولیت اختیار کرلی اور اسکا وائس پریذیڈنٹ بن گیا۔یوں تعلیم کے ساتھ ہماری کشمیر کے سلسلے میں سرگرمیاں شروع ہوئیں۔آزاد مظفر صاحب صدر تھے۔رسالہ شعور نکالا گیا۔جسکی سرپرستی سردار نثار صاحب کے سپرد تھی اور سردار عبدالخالق موصی انکی سرپرستی کررہے تھے۔یوں رسالہ نکالا گیا۔جس کو خاصی شہرت ملی۔اس دوران اکثر کے۔ایچ۔خورشید مرحوم کو ایک دوبار دیکھا۔ان سے ہاتھ ملایا۔مگر ان سے تفصیلی ملاقات نہ ہوسکی۔یوں وقت گذرتا گیا۔ایل ایل۔بی کے فائنل ایر میں میری ہمشیرہ کی شادی مانٹریال راجہ قدیر صاحب سے ہوئی۔اوران کی بہن کی شادی مجھ سے ہوئی۔فیصلہ ہوا کہ میں لاء کرلوں تو پھر مانٹریال کا پروگرام بنائیں گے۔اس دوران گھر کی کچھ ذمہ داریاں تھیں۔ چنانچہ سارے خاندان کی واپسی پر میں دوبارہ لاء کالج میں آگیا۔اس دوران الیکشن ہوئے جس پر دھاندلی کے الزامات لگے۔ہمارے لاء کالج کے پروفیسر حضرات کھلے عام کہہ رہے تھے کہ فوج اقتدار سنبھالنے کا پروگرام بنا رہی ہے۔بھٹو انکے اقتدار کے آگے رکاوٹ بن چکے ہیں۔ اسلئے ان کے دن پورے ہونیوالے ہیں۔پاکستان اتحاد نامی تحریک نے جنم لیا۔جو بھٹو کو ہٹانے کیلئے آگے بڑھی۔ذوالفقار علی بھٹو واقع ایک معیاری سیاستدان تھے۔مگر انکے پاؤں زمین پر نہ تھے۔بڑے جاگیردار تھے۔اسلئے پاکستان کو بھی شائید جاگیر سمجھ بیٹھے۔انکو اپنے آپ پر اس تک اعتماد تھا کہ انکو کبھی شک نہیں گذرا کہ ایک جونیئر جرنیل جسکو چیف آف سٹاف بنایا ہے۔یوں انکو اقتدار سے الگ کردیگا۔اس دوران مسلم کانفرنس کی قیادت نے

بھی قومی اتحاد کے ساتھ اتحاد کرلیا۔وجہ یہ تھی کی جھڑ کے دور میں انکو اقتدار سے علیحدہ کردیا گیا تھا۔اور سردار قیوم صاحب نے بائیکاٹ کردیا تھا۔وزارت امور کشمیر اس دفعہ انکی کوئی مدد نہ کرسکی۔وہ جب لاہور آتے تو ہمارے علاقے کے ایک وکیل سردار عنائت صاحب جو لاہور میں وکالت کرتے تھے، انکے استقبال کیلئے اپنے نوجوانوں کے ہمراہ موٹر سائیکل پر سوار صاحب کی کار کے ساتھ ہوتے موصوف کو اس استقبال کی وجہ سے لاہور میں خاصی عزت ملی۔پہلے وہ لاہور فلیٹیز ہوٹل میں قیام کرتے رہے۔ جہاں کا خرچ لاہور کے ایک کشمیری فیملی کے فرد ادا کرتے تھے۔سردار عنائت صاحب کو کہا گیا کہ جب وہ اقتدار میں آئیں گے تو موصوف کو یا تو عدلیہ کا جج بنوادیں گے یا اسمبلی کا ٹکٹ دے دیں گے۔میں نے انہیں بہت سمجھایا کہ سردار صاحب آپ اپنے کام پر توجہ دیں مگر وہ نہ مانے اور یوں وہ لگے رہے۔موصوف کو جلد ہی گرفتار کرکے آزاد کشمیر کے پلندری جیل میں منتقل کردیا گیا اور سردار سکندر حیات صاحب نے انکی جگہ مسلم کانفرنس کی نمائیندگی کی۔موصوف ساسی شو کے قائل نہ تھے۔وہ آتے اور اجلاس میں شرکت کرکے واپس چلے جاتے۔ان سے ایک دو دفعہ ساتھیوں کے ساتھ مختصر ملاقات ہوئی۔انکے خیال میں یہ محض ڈرامہ بازی ہے۔اقتدار فوج کے حوالے ہونے والا ہے۔ایک موقع ایسا بھی آیا پیپلز پارٹی اور پاکستان قومی اتحاد میں دوبارہ الیکشن پر اتفاق رائے ہونیوالا تھا۔مگر اطلاعات کے مطابق سردار صاحب نے فوجی حکام سے مل کر بھٹو قومی اتحاد کے درمیان بات چیت سے انہیں آگاہ کردیا اور فوری طور پر ایکشن لے لیا گیا۔جس کے عوض سردار صاحب کو نہ صرف ضیاء الحق نے ارب پتی بنادیا۔ بلکہ سردار صاحب نے اپنی پہلی گولی والی بندوق انکو تحفہ میں دی۔جسکے بارے میں اکثر وہ اعلان کرتے تھے کہ انہوں نے پہلی گولی چلا کر جہاد کا اعلان کیا۔صدر ضیاء الحق موصوف کو اپنا مرشد قرار دیتے تھے۔وجہ صاف ظاہر تھی۔موصوف نے انکو ساری اطلاعات کی رپورٹ فراہم کیں۔جب ٹکٹ کا وقت آیا تو سردار عنائت صاحب اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ آزاد کشمیر گئے۔ٹکٹ کیلئے درخواست دی مگر سردار صاحب یا کسی اور لیڈر نے ان سے ملاقات تک نہ کی۔اسکے بعد جب سردار صاحب مایوسی کے عالم میں لاہور پہنچے تو انکو احساس ہوا۔انکی وکالت کا کام اب زیادہ نہیں رہا تھا۔دوبارہ سب کچھ شروع کیا۔مجھے کہا۔آپ کا کہنا درست تھا۔مگر اب بہت دیر ہوچکی تھی۔ابتدا میں بھٹو کی وکالت کے فرائض چند اساتذہ کرام نے بھی ادا کئے۔انمیں ہمارے ایک استاد بھی شامل تھے۔جو بار ایٹ لاء تھے۔اور فوجداری مقدمات کے ماہر تھے۔مگر انہیں یقین نہیں تھا۔عدالتیں انصاف مہیا کرسکتی ہیں۔۔

مجھے یاد ہے جس دن بھٹو کو پھانسی ہوئی۔ہم ہوسٹل نمبر ۱۹ میں تھے۔میں اور سردار نثار صاھب اکھٹے رہتے تھے۔صبح سویرے ہمارے کمرے پر کسی نے دستک دی۔دروازہ کھولا تو ایک فوجی آفیسر اور نوجوان گارڈ کھڑا تھا۔ہمیں کہا گیا کہ سامان باندھین اور فوراً واپسی کی راہ لیں۔میں نے عرض کی جناب ہمارے پاس تو کرایہ بھی نہیں ہے۔ہم آزاد کشمیر کے رہنے والے ہیں۔۔نثار صاھب کچھ نہ بولے۔اس نے پچاس روپے کا نوٹ نکال کردیا۔یہ کافی ہونگے۔میں نے شکریہ ادا کیا۔۔اور میں اپنا بیگ اور چند کتابیں اٹھائیں اور واپسی کا پروگرام بنایا۔نثار صاحب کے دوسرے دوست بھی تھے۔اسلئے وہ انکے ہاں چلے گئے۔لاہور شہر اداس تھا۔کسی نے باہر آنے کی ضرورت محسوس نہ کی۔معمولی مظاہرے ہوئے مگر سب کو معلوم تھا۔اب مظاہروں کا کوئی فائیدہ نہیں۔جو ہونا تھا سو ہوگیا۔

میں نے اپنے کپڑے بیگ میں ڈالے۔لاء کی ساری کتابیں لیں اور نوٹس وغیرہ لئے اور سیدھا گھر

پہنچا۔ چند ماہ بعد ضیاء الحق نے اقتدار پر مضبوطی سے قبضہ کرلیا تھا۔ پاکستان قومی اتحاد کے مرکزی راہنما اور جنرل کونسل کے ممبر جنرل ضیاء الحق صاحب کے حق مین اختیارات میں تاریخی بیانات جاری کر چکے تھے۔اوراب آزاد کشمیر میں انکی حکومت یقینی تھی ۔لاہور کی اہم شخصیات نے سردار قیوم کے بارے میں تحفظات کا اظہار کیا۔ بعدازاں جب جنرل ضیاء الحق مرحوم نے سردار صاحب کی مریدی قبول کی اور پہلی گولی والی بندوق تحفہ کے طور پر لی تو روز نام جنگ کے ایڈیٹر رپورٹر جوامریکہ میں مقیم ہیں۔انہوں نے کچھ عرصہ قبل راقم کو بتایا کہ جب جنرل ضیاء الحق صاحب بندوق لے رہے تھےتو آزاد کشمیرا سمبلی کے ضلع پونچھ کے ایک ممبر اسمبلی جو پاک آرمی مین آفیسر رہ چکے تھے۔انہوں نے جنرل صاحب سے کہا کہ جناب آپ کس شخص کی باتوں پر عمل کر رہے ہیں۔تو موصوف بولے وقت پر ان صاحب نے میری مدد کی ۔موصوف امریکہ میں جیوٹی وی کے مینیجنگ ڈائیریکٹر بھی رہے۔

یونیورسٹیاں کھلیں تو ہم نے فوراً تیاری شروع کی۔ میں نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ میرا لاء کا امتحان پاس کرنا ضروری ہے۔ کیونکہ شائید اسکے بعد میرے پاس وقت نہ ہو۔میں کینیڈا واپسی کی تیاری کر رہا تھا۔کشمیر سٹوڈنٹس ویلفیئر ایسوسی ایشن کے سدر جناب آزاد مظفر صاحب اپنے امتحانات سے فارغ ہو چکے تھے۔ آخری اجلاس کی صدارت میں نے کی جسمیں کے۔ایچ۔ خورشید مرحوم کو مہمان خصوسی کی حیثیت سے بلایا گیا۔سب طالبعلم موصوف سے ملنے کے خواہش مند تھے۔میں ان سے باغ میں ڈاکٹر ضیغم سلیم صاحب کے گھر سیّد حسن شاہ گردیزی مرحوم کے ساتھ مل چکا تھا۔ جب میں نے انکو بتایا تو بہت خوش ہوئے۔ اجتماع کے اختتام پر میں نے ان سے درخواست کی کہ میں آپ کا انٹرویو لینا چاہتا ہوں۔ مستقبل میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔ اسمیں شامل کرنا چاہتا ہوں۔اور پھر راقم نے انہیں دعوت دی اور چند دن بعد ہم ریسٹورنٹ بیٹھے اور میں انٹرویو لے رہا تھا۔ یہ میری زندگی کا ایک اہم دن تھا۔ جس دن میں ایک ایسے شخص سے انٹرویو لے رہا تھا جو پاکستان بننے کا نہ صرف گواہ تھا بلکہ قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کے ساتھ اس مشن میں با قاعدہ قائد اعظم مرحوم کا دستِ راست تھا۔

واپس گاؤں پہنچا تو سفارتخانہ کی طرف سے خط آیا ہوا تھا۔ آپکا انٹرویو تھا۔ انٹرویو کے بعد میڈیکل کا مرحلہ آیا۔ ڈاکٹر موصوفہ نے کہا کہ مجھے آپ کا سابقہ میڈیکل ریکارڈ درکار ہوگا۔ جسمیں آپ کی ہسپتال میں معائنہ رپورٹ وغیرہ شامل ہے۔ میں نے ان سے کہا۔ محترمہ میرا تعلق سابق کشمیر کی ریاست پونچھ سے ہے۔ ہمارے ہاں بچے گھر میں پیدا ہوتے ہیں۔ اور ہسپتال میں ہم اس وقت جاتے ہیں جب اس دنیا سے روانگی کا وقت آتا ہے۔ کوئی ایسا حادثہ پیش نہیں آیا کہ مجھے طبّی معائینہ کی ضرورت پیش آتی ہو۔ خیر یہ باتیں سن کر موصوفہ مسکرائیں طبّی معائنہ، ایکسرے وغیرہ کا آرڈر دیا۔ اور ایک مہربانی کی کہ مجھ سے کسی قسم کا معاوضہ طلب نہیں کیا۔ اتنا کہا کہ آپ کو باہر جانا چاہیئے ۔اور گڈ لک کہہ کر رخصت کیا۔ دو ماہ بعد ایک ہی دن مجھے ایمبیسی میں بلایا گیا کہ ویزا تیار ہے۔ اور ساتھ ہی میرا رزلٹ کارڈ آ گیا۔ جسمیں لاء کا اامتحان نمایاں نمبروں سے پاس کرنے پر گاؤں کے لوگوں نے مبارکباد دی۔ میرے دادا جان کے بھائی مجاہد راجہ محی الدین خان مرحوم نے کارڈ میرے ہاتھ میں تھمایا اور فرمایا۔ وکیل صاحب مبارک ہو۔ ان کے چہرے سے فخر اور خوشی دونوں صاف نظر آ رہے تھے۔ فرمایا۔ ایک وقت تھا جب قاعدے کی پہلی کتاب کیلئے رقم نہیں ہوتی تھی اور آج ہمارا بیٹا لاء کر کے دوسرے ملک میں جانے کی تیاری کر رہا ہے۔۔ وہ خوش تھے۔ کہنے لگے۔ بیٹا۔ یہاں سے بھاگو۔ یہاں سیستدان شیطان لوگ ایک ایک روپے کیلئے

سیاستدانوں کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ روزگار کی کمی ہے اور مرکزی حکومت نے اپنے ایجنٹ پال رکھے ہیں جو صرف اپنے گھر بھر رہے ہیں۔ ایک دفعہ بچ گئے ہو۔ دوسری دفعہ جان سے جاؤ گے۔ یہ لوگ عوامی حقوق کیلئے آواز اٹھانے والوں کو معاف نہیں کرینگے۔

موصوف ۱۹۴۷ھ میں والد صاحب کے ساتھ پونچھ محاذ پر تھے۔ اور انکے بھائی راجہ قاسم علیخان اور میرے تایا حوالدار میجر راجہ سید اکبر خان مرحوم میں انکے ساتھ تھے۔ موصوف نے پونچھ سے ہندوؤں کے انخلا کے افسوسناک واقعات کا ذکر کیا۔ انکا کہنا تھا کہ اگر ہمارے سیاسی لیڈران اس وقت صورت حال کا ادارک کرتے ہوئے غیر مسلم آبادیوں کو تحفظ فراہم کرتے تو یہ واقعات رونما نہ ہوتے جو جموں میں قتل عام کی صورت میں ہوئے۔ کشمیر میں پانچ ہزار سال سے ہر مذہب کے لوگ آباد کار آرام سے رہتے آئے ہیں۔۔ وہ بنگراں کے ہندوؤں کا اکثر ذکر کیا کرتے تھے۔ جن کے ساتھ انکے خاصے اچھے تعلقات تھے۔ اور روانگی سے قبل انکے ساتھ ایک ملاقات کا انہوں نے خصوصی ذکر کیا۔ جنگ کے دوران انسانیت دم توڑ جاتی ہے۔ لوگوں کے سر پر جنون سوار تھا۔ پونچھ کے لوگ حد سے زیادہ غریب اور مشکلات سے دوچار تھے۔ انکو وقت پر گائیڈ نہیں کیا جا سکا۔ اس وقت کے سب سے اہم لیڈر مولانا عبداللہ صاحب صحت کی خرابی کے باعث زیادہ سفر کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔ چنانچہ لاقانونیت نے ڈیرے ڈالے اور یوں کشمیر ایک جیتی ہوئی جنگ ہار گئے۔

ایک ہفتے بعد میں روانگی کیلئے تیار تھا۔ سب سے اجازت لی اور راولپنڈی پہنچ گیا۔ سارے کاغذات مکمل ہو گئے۔ ٹکٹ ایئر فرانس کا پیرس تھا اور ایئر کینیڈا کا پیرس، مانٹریال کا لیا۔ کراچی سے روانگی تھی۔ کراچی ہمشیرہ کے گھر قیام کیا۔ اور دو دن بعد پیرس کے ڈیگال ایئر پورٹ پر تھا۔۔ وہاں جا کر پہلی بار احساس ہوا کہ انگریزی زبان کی اتنی حکمرانی نہیں جتنا ہم پاکستان میں سوچتے ہیں۔ فرانس میں انگریزی زبان کا نام ونشان نہیں۔ یہانتک کہ ایئر پورٹ پر بھی انگریزی زبان بہت کم بولی جاتی ہے، وہاں میرا پاسپورٹ چیک کرنے کے بعد مجھے ایئر کینیڈا کے آفس کی طرف اشارہ کیا۔ وہاں پہنچا تو پہلا سوال کاؤنٹر پر فرانسیسی زبان میں کیا گیا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں پہلی دفعہ جا رہا ہوں۔ خاتون بولی ٹھیک ہے مگر مانٹریال کا شہر فرانسیسی زبان بولنے والوں کا ہے۔ میں نے کہا جب پہنچوں گا تو زبان بھی سیکھ لونگا۔ خاتون بہت خوش ہوئی تو آپکو فرانسیسی زبان پسند ہے۔ میں نے ہاں میں جواب دیا۔ فوراً میری سیٹ کنفرم کی اور بورڈنگ کارڈ دے دیا۔ اور بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر گیٹ کھلے گا تو آپ جا سکتے ہیں۔۔ خیر میں چند گھنٹوں کے بعد مانٹریال کینیڈا کی طرف رواں دواں تھا۔ جب مانٹریال پہنچا تو شام ہو چکی تھی۔ مجھے علم تھا کہ باہر میرہ ہمشیرہ، اہلیہ اور سارے خاندان کے لوگ بیتابی سے انتظار کر رہے ہونگے۔ تمام مراحل مکمل ہونے کے بعد میں نے ایئر پورٹ پر ہی فرانسیسی زبان سیکھنے کیلئے اپنے آپ کو رجسٹر کر دیا۔ باہر خاندان کے افراد سے ملاقات ہوئی تو ایسا لگا جیسے میں اپنے ہی گھر میں ہوں۔ بچپن میں میں پھوپھی جان کے گھر میں زیادہ ہوتا تھا۔ وہ ہمیں اپنے بچوں سے بھی زیادہ پیار کرتی تھیں۔ انتہائی نیک اور پرہیزگار، پانچوں وقت کی نمازی اور انتہائی اخلاق کی حامل خاتون تھیں۔ میں نے ان جیسا پیار کرنیوالا انسان نہیں دیکھا۔ چند ہفتے بعد فرانسیسی زبان میں داخلہ کیلئے انٹرویو لیا گیا اور مجھے داخلہ مل گیا۔ چھ ماہ کا کورس تھا۔ جسمیں لکھنے اور بولنے کی پریکٹس کرائی جاتی تھی۔ کلاس میں فرانسیسی زبان کے علاوہ کسی دوسری زبان بولنے کی اجازت نہ تھی۔ اساتذہ نے جس محنت سے تمام امیگرنٹس کو فرانسیسی زبان سکھائی کہ جب چھ ماہ

بعد مجھے سرٹیفکیٹ ملاتو ہم آسانی سے فرانسیسی زبان میں رابطہ قائم کرسکتے تھے۔ میری کلاس میں زیادہ تر طالبعلم ویتنام، لاؤس اور فلپائن کے تھے۔ لاؤس کے ایک مسلمان محمد موسیٰ تھے جو کمیونسٹوں کے دورِ حکومت میں ظلم وستم سے دوچار ہوئے اور صرف اپنے آپ کو بچانے میں کامیاب رہے۔ انکا پورا خاندان کمیونسٹوں کا نشانہ بنا۔ اور موصوف اب یہاں مکمل طور پر عہائیش پذیر ہونے کیلئے آئے تھے۔ خوش تھے کہ اب کسی خوف وخطرے کے بغیر زندگی گذار سکیں گے۔ آزادی کی نعمت کا احساس انکو ہوتا ہے جو ظلم کی چکّی سے آزاد اور سلامتی کے ساتھ نکل کر کھلی فضاؤں میں آتے ہیں۔ انکے آنسو دیکھ کر پوری کلاس رنجیدہ ہوجاتی تھی۔ ہماری ایک فرانسیسی استاد نے اسکی مدد کیلئے سوشل ورکر کا بندوبست کیا جو اسکی مدد کررہی تھی۔

کورس ختم کرنے کے بعد میں نے آگے لاء کی تعلیم حاصل کرنے کے بجائے کاروبار کو ترجیح دی۔ آزاد کشمیر میں والدین اور چھوٹے بہن بھائیوں کو چھوڑ آیا تھا۔ اب میں ذمہّ داری خود سنبھالنا چاہتا تھا۔ چنانچہ میں اور میری اہلیہ نے یہاں کی ایک اعلیٰ پایہ کی کاروباری عمارت پلاس بوناونچر (Place Bonaventure) میں ایک دوکان کرایہ پر لی۔ اس فلور پر ایک ہندوستانی کی بھی دوکان تھی۔ یہ دوکان لدّاخ کے نام پر تھی اور اسمیں کشمیری ہینڈی کرافٹ فروخت ہوتی تھی۔ میں نے مود دُو پاکستان (Mode du Pakistan) کے نام سے دوکان کو رجسٹر کروایا۔ ہندوستانی شخص نے بہت دباؤ ڈالا کہ مجھے دوکان نہ ملے۔ مگر میں نے انکو ساری صورت حال سمجھائی کہ ہندوستان اور پاکستان دو الگ الگ ملک ہیں۔ اسے شائید اس بات کا علم نہیں تھا کہ میں کشمیر سے ہوں۔ چنانچہ جب دوکان کا لیز میرے نام ہوگیا تو موصوف نے دوکان ایک سِکھ کو فروخت کردی اور یوں ہم دونوں کا جھگڑا ختم ہوگیا۔ سردار جی اچھے انسان تھے ان سے رابطہ رہا۔ نہ میں نے ان کو کوئی شکوہ کیا اور نہ انہوں نے کبھی شکایت کی۔ اس دوران بوٹیک لدّاخ کے مالک سے میرا رابطہ ہوا۔ وہ فرانسیسی تھا۔ مگر کشمیر کے ساتھ اسے عشق تھا۔ وہ بیس سال قبل کشمیر کسی فرانسیسی دوست کے ساتھ گیا اور پھر وہیں کا ہوکر رہ گیا۔ ہر سال گرمیوں میں جاتا۔ وہاں سے ہینڈی کرافٹ اور کارپٹ لاتا اور مانٹریال اور کیوبیک سٹی تک فروخت کرتا۔ ایک شوروم پلاس بنوائٹر میں لے لیا اور پرچون کا کام شروع کیا۔ سرینگر کی ہر چیز اس دوکان سے مل سکتی تھی۔ وہ اکثر جھیل ڈل اور ہاؤس بوٹ کا ذکر کرتا۔ جن لوگوں سے اسکے تجارتی مراسم تھے انمیں ہندو اور مسلم سب تھے۔ وہ ایک کشمیری پنڈت کے گھر میں قیام رکھتا تھا۔ اور اسے ان لوگوں نے مفت کمرہ دے رکھا تھا۔ کھانے پینے کے بھی وہ روپے نہ لیتے تھے۔ گویا ہر سال وہ صرف ایئر لائن کا کرایہ ادا کرتا تھا اور چار ماہ وہاں گذار دیتا۔ انکی دوکان پر ایک لڑکا کام کرتا تھا اور جب واپس آتے تو بالکل کشمیری لگتے تھے۔ داڑھی لمبی اور اسکے ساتھ ٹوپی اور بعض اوقات لمبا کشمیری ڈریس پہن لیتے۔ انکو علم تھا کہ میں کشمیر سے ہوں۔ مگر رہن سہن مختلف تھا۔ مجھے انکے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے میں بڑا مزہ آتا۔ ایک دن انہوں نے دعوت دی چلوا کھٹے چلتے ہیں۔ مگر میں نے ان سے جب اپنی صورت حال کا ذکر کیا تو موصوف نے اپنے دوست کشمیری پنڈت سے اس کا ذکر کیا اور اس نے کہہ دیا کہ بھائی اس بیچارے کو ادھر نہ لانا۔ مقامی اداروں کو پتہ چل گیا تو آپکا دوست غائب ہوجائیگا۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے کشمیر جانے کا ذکر نہ کیا۔ اس دوران مانٹریال میں ''اپنا وطن'' کے چیف ایڈیٹر ارشد رندھاوا سے رابطہ ہوا جو مقامی شاعر بھی تھے اور صحافی بھی تھے۔ اس سلسلے میں جمّوں وکشمیر ہیومین رائٹس کونسل کینیڈین برانچ کی بنیاد ڈالی گئی اور سیکریٹری جنرل ارشد رندھاوا بنے اور یوں آزاد کشمیر کے چند کارکنوں کے ساتھ مل کر ہم نے مرکزی حکومت کو مسئلہ کشمیر پر

انسانی حقوق کے سلسلے میں آواز بلند کرنے کو کہا۔ ہماری سرگرمیوں کا سلسلہ جاری رہا۔ اس دوران میرا رابطہ مجید نظامی صاحب سے ہوگیا۔ انہوں نے کہا کہ آپ اگر مکتوب کینیڈا کے نام سے کالم لکھیں۔ جسمیں پاکستان اور کشمیر دونوں معاملات میں مضامین ہوں تو میں اسکو مستقبل کالم کا درجہ دونگا۔ اور یوں اس پر اپنے خیالات کا اظہار بھی کرسکیں گے اور ہماری سرکولیشن میں بھی اضافہ ہوگا۔ چنانچہ مکتون کینیڈا کی وجہ سے انکے سرکولیشن آزاد کشمیر کے مختلف علاقوں میں خاصی آگے بڑھی اور انہوں نے میرا شکریہ ادا کیا۔ میرے لئے اتنا کافی تھا کہ میں مسئلہ کشمیر کے سلسلے مین آواز اٹھانے کے قابل بن گیا تھا۔ اور ساتھ ہی پاکستان کے بارے میں بھی مضامین لکھنے کی پوزیشن میں تھا۔ میرے یہ مضامین اکثر ''اپنا وطن'' کینیڈا میں شائع ہوتے رہے۔

دوسری طرف ہفت روزہ ''کشیر''، فیض آباد، راولپنڈی جو معروف کشمیری صحافی خواجہ عبدالصمد درانی اور چوہدری غلام عباس مرحوم کے قریبی ساتھی کی زیر سرپرستی میں شائع ہوتا تھا۔ خواجہ صاحب میرے مضامین پر اکثر تھوڑی بہت تنقید ضرور کرتے اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ اس اخبار کے ہر ماہ چار ایڈیشن مجھے بھیج دیتے اور اندر اکثر نوٹ ضرور ہوتا۔ میں شکریہ کے ساتھ انکے خیالات پر ان سے خط کے ذریعے تبصرہ کرتا رہا۔ اکثر یہ مضامین ہر ہفتہ میں بذریعہ خط ہفت روزہ '''کشیر'' اور روزنامہ نوائے وقت میں بھیجتا رہا۔ اور دونوں اخبارات نے میرے تمام مضامین ہو بہو شائع کئے۔ حالانکہ بعض اوقات یہ مضامین دونوں اخبارات کی پالیسیوں کے خلاف تھے۔ مگر دونوں عظیم صحافی آزادی اظہار رائے کے بڑے حامی تھے۔ جب میں واپس پاکستان گیا تو مجید نظامی صاحب سے لاہور میں تفصیلی ملاقات ہوئی اور جناب خواجہ عبدالصمد درانی صاحب مرحوم سے فیض آباد انکے دفتر میں تفصیلی ملاقات ہوئی۔ یہ وقت میرے لئے ایک یادگار دن کی حیثیت سے ہمیشہ میرے ذہن مین نقش رہیگا۔ خواجہ صاحب نے میری نہ صرف حوصلہ افزائی کی بلکہ جھوٹ اور سچ کی اس دوڑ میں سچائی کا ساتھ دیا۔ اور میرے ان مضامین کو جگہ دیکر بعض سیاستدانوں کا اصل چہرہ بے نقاب کرنے میں میری مدد فرمائی۔

اس دوران آزاد کشمیر کے تمام سیاستدانوں سے میری تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ میرا خیال تھا کہ وہ لوگ اس نازک وقت میں کشمیری عوام کی مدد کیلئے اٹھ کھڑے ہونگے۔ کیونکہ وقت بدل رہا تھا۔ اگر ہم نے دیر کردی تو بعد میں یہ مسئلہ اور الجھ جائیگا۔ میں نے اس سلسلے میں سردار عبدالقیوم صاحب سے کشمیر ہاؤس میں تفصیلی بات چیت کی۔ سردار سکندر حیات صاحب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ راجہ ممتاز حسین راٹھور سے بھی میری کئی دفعہ بات ہوئی۔ ان سے فون پر میں نے مسئلہ کشمیر پر بات کی اور انہیں بتایا کہ کس طرح ہم مسئلہ کشمیر کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ یا آزاد حکومت کو نمائیندہ حکومت بن کر آگے آنا ہوگا یا پاکستان کی حکومت کو مجبور کرنا ہوگا کہ اس سخت ترین آواز اٹھائیں اور کشمیر کی پیچیدہ صورت حال پر عالمی برادری کو متوجہ کریں۔ اس سلسلے میں سردار سکندر حیات صاحب اور راجہ ممتاز حسین راٹھور مرحوم کے خیالات ایک جیسے تھے۔ دونوں کے خیال میں حکومت پاکستان کو مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں زیادہ دلچسپی میں وہ صرف چند لیڈروں کے ذریعے مسئلہ کشمیر کو صرف اخبار کی حد تک زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک نامور لیڈر کے یہ الفاظ آج بھی میرے کانوں میں پڑتے ہیں تو آنکھیں بند کرلیتا ہوں۔ ''کہ جالب! اگر کشمیر آزاد ہوگیا تو وادی کے لوگ حکومت کریں گے۔ ہمیں تو کوئی گھاس بھی نہیں ڈالے گا۔ آج تو ہم اس علاقے کے حکمران ہیں''۔ اسکے بعد میں نے محسوس کرلیا کہ یہ لوگ مفاد پرستوں کا ٹولہ ہیں۔ یہ صرف

کشمیر کی آواز کاروبار کیلئے اخبارات میں بلند کرتے رہیں گے۔ بعدازاں ان لیڈروں نے ثابت کر دکھایا کہ وہ واقعی کشمیر کے نام پر کھلے عام کاروبار کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں راقم کی بعض اطلاعات کے مطابق بہت سے کشمیری لیڈروں نے مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد کرنیوالوں کو بدنام کرنے کیلئے بعض عالمی تنظیموں سے فنڈز حاصل کیئے اور غلط اطلاعات فراہم کیں۔ جنمیں لشکر طیّبہ کا نام بھی شامل تھا۔ حالانکہ مقبوضہ کشمیر میں لشکر طیّبہ کا نام صرف انڈین ادارے کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی کو عالمی سطح پر بدنام کرنے اور کشمیر میں دہشت گردی کے نام پر کھلے عام ظلم وستم کرنے اور خواتین کی آبرو ریزی، اغوا اور قتل کرنے میں استعمال کرتے رہے اور فوج اس کام میں کھلے عام بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی کرتی رہی اور ان لیڈران نے اپنے مالی مفادات اور مغربی ملکوں میں کھلے عام وفود کی سہولتیں ملنے اور ویزے کیلئے مغربی سفارتکاروں کو غلط اطلاعات فراہم کرتے رہے۔ اس سلسلے میں مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد آزادی کیلئے کام کرنے والے لوگوں کو خوب بدنام کیا جاتا رہا۔ اس سلسلے میں انڈیا کو کوئی کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کام ہمارے لیڈر بخوبی انجام دیتے رہے۔

۱۹۸۰ء سے ۲۰۰۱ء تک میں نے کئی بار یورپ اور پاکستان کا چکر لگایا۔ جب بھی پاکستان کا پروگرام بنتا تو برٹش ایئرویز کے ذریعے جاتے تو لندن میں واپسی پر قیام ہوتا۔۔ ساؤتھ ہال لندن کے ایریا میں ہمارے ایک فیملی سے تعلقات بن گئے۔ یہ لوگ گجرات کے رہنے والے تھے۔ ہماری ایک کشمیری فیملی جو ہمارے رشتہ دار تھے۔ انکے نزدیک ہی انکا گھر تھا۔ پہلی دفعہ جب میں اہلیہ اور بیٹی کے ہمراہ گیا۔ تو ہمارا پروگرام ایک ماہ انگلینڈ کی سیر کا تھا۔ چنانچہ ہم نے ان سے ایک کمرہ کرایہ پر لیا تاکہ ہم اپنا سامان چھوڑ کر دوسرے شہروں کی طرف نکلیں۔ شریف خاندان کے لوگ تھے۔ انہوں نے ۱۲۰ پونڈ ایک ماہ کا کرایہ طلب کیا۔ کھانے پینے کیلئے ہم اکثر باہر کھالیتے تھے۔ کبھی کبھار انکے ہاں ناشتہ کر لیتے۔ آخر میں میری اہلیہ کچھ رقم چھوڑ کر آئیں۔ بہت ناراض ہوئے۔ اسکے بعد جب بھی ہمارا پروگرام بنا تو انکا لڑکا ایئرپورٹ پر ہمارے انتظار میں ہوتا تھا۔ برطانیہ چونکہ ایک عرصے تک برصغیر میں حکمرانی کرتا رہا اور دوسری عالمگیر جنگ میں بیشمار کشمیری ناشندوں نے فوج میں خدمات سرانجام دیں۔ اسلیئے جب برطانیہ کو ۱۹۴۷ء میں ہونے والی تباہی کے بعد فیکٹریاں اور تعمیراتی کاموں میں مزدوروں کی ضرورت پیش آئی تو آزاد کشمیر ضلع میرپور سے خاصی تعداد میں افراد کو امیگریشن دے دی۔ یہ لوگ انتہائی محنتی تھے۔ اور برطانیہ کو اس وقت اس قسم کے لوگوں کی ضرورت تھی۔ انہوں نے بعدازاں امیگریشن کا سلسلہ شروع کیا۔ آج انکی تعداد کئی لاکھ ہے۔ ایک کشمیری سیاستدان تو ۱۹۹۰ء کے دور میں انکی تعداد ۵ لاکھ بتاتے تھے۔ یہ لوگ پورے انگلینڈ میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تجارت، ملازمتوں اور سیاست میں سب سے آگے ہیں۔ اور اکثر کئی علاقوں میں ممبر پارلیمنٹ منتخب ہوتے ہیں۔ لارڈ نذیر احمد کا تعلق بھی اسی علاقہ سے ہے۔ ایک عرصہ سے ہاؤس آف لارڈز کے ممبر ہیں۔ اور مسئلہ کشمیر پر اکثر آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔ اسکے علاوہ کئی تنظیمیں ہیں جو اس سلسلے میں آواز بلند کرتی رہتی ہیں۔ اور بعض اہم شخصیات انفرادی طور پر بھی مسلسل آواز بلند کرتے رہے ہیں۔ جنکا مقصد حق وانصاف کیلئے آواز بلند کرنا تھا۔ انکا نہ کشمیر کی سیاست سے کوئی تعلق تھا۔ نہ انہوں نے اپنی شہرت کیلئے یہ کام کیا۔ یہ لوگ خاموشی سے اپنی جدجہد کرتے رہے۔ اور انکی کارکردگی کو آگے کیش کرنے کیلئے آزاد کشمیر سے آنیوالے سیاسی وفود تھے جو اکثر اپنے پبلک فنڈز یہاں خرچ کرنے کیلئے آتے۔ بعض نے اپنے اکاؤنٹ کھول رکھے تھے۔ جو سرکاری فنڈز یہاں جمع کروا کر واپس جاتے

اور اس کے ساتھ ہی مقامی لوگوں سے بھی چندہ کی رقم وصول کرتے اور اس کے عوض ان سے کافی وعدے کر کے جاتے۔ حکومت آزاد کشمیر کا طریقہ واردات یہ تھا کہ وہ اپوزیشن والوں کو بھی نوازتے تاکہ انکی کرپشن کا معاملہ سامنے نہ آسکے۔ اس سلسلے میں سال میں ایک دو دفعہ اپنے ممبران اسمبلی کے ساتھ دوسروں جماعتوں کو بھی شریک کر لیتے۔ یوں یہ سلسلہ ۲۷ سال سے چل رہا ہے۔ محکمہ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ کے آفیسر نے ۱۹۹۰ء کے دوران سفر کے دوران مجھ سے ملاقات کی اور کہا کہ اگر تحقیقات کی جائے تو زکوٰۃ فنڈز سے لیکر پبلک فنڈز سے حاصل کی گئی رقوم کا اندازہ کئی ارب روپے ملتا ہے۔ موصوف نے اس سلسلے میں ایک سڑک کا ذکر کیا۔ انکا کہنا تھا کہ کوہالہ باغ سڑک کاغذات پر ہائی وے ہے۔ اس سڑک کا ٹھیکہ کئی دفعہ کیا گیا اور چھوٹی موٹی مرمت کر کے کروڑوں روپے نکالے گئے اور یوں یہ رقوم براہ راست اعلیٰ قیادت نے وصول کیں۔ ظاہر ہے ٹھیکہ دار نے اپنا حصہ وصول کیا۔ کام یا اخراجات کے بغیر اسے رقم ملے تو اسے کیا پرواہ ہے۔ کچھ حصہ مرکز میں منسٹری کے افراد کو بھی مل جاتا ہے۔ اسکے علاقہ ترقیاتی کام کی رپورٹ اکثر فائلوں سے نکال دی جاتی ہے۔ تاکہ آنیوالی حکومتوں کو اسکی خبر نہ ہو۔ مجھے کشمیر میں ہونیوالے واقعات سے دلچسپی بھی تھی اور آزاد کشمیر میں پسماندگی اور مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں ان سایسی راہنماؤں کے جھوٹ کا بھی مجھے بخوبی علم تھا۔ اسلیئے دوروں کے دوران اس سلسلے میں لندن اور نیویارک میں بھی ساری صورت حال کی مکمل رپورٹ ملتی رہی۔ نیویارک میں کشمیری کمیونٹی ایک محرّک ترین راہنما راجہ محمد سلیم خان آف گوراہ تھے۔ راجہ صاحب یونیورسٹی کے زمانہ کے میرے دوست تھے۔ انکا تعلق جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ سے تھا۔ اور امان اللہ خان کے اہم ساتھیوں میں سے ایک تھے۔ نیویارک میں کشمیر کے حق میں یو۔این۔او کے سامنے مظاہروں کے انتظامات میں انکو عمل دخل حاصل تھا۔ اور آزاد کشمیر کے تمام لیڈران نیویارک آمد سے قبل ان سے مذاکرات کرتے تھے۔ کشمیر کاز کیلئے سارا کام وہ کرتے تھے۔ اور اخبارات میں سرخیاں آزاد کشمیر کے ان لیڈران کی ہوتی تھین۔ جو کروڑوں روپے غریب عوام کے ترقیاتی فندز سے نکال کر ٹاپ کلاس ہوٹلوں میں رہتے تھے۔ ہمارے فقیر سردار عبدالقیوم صاحب تو ایک دفعہ اپنے باورچی کو بھی ساتھ لائے۔ کسی نے ان سے پوچھ لیا۔ آپ فرش پر سونے کا دعویٰ کیا کرتے تھے۔ آجکل آپ کے باورچی بھی آپ کے ساتھ سفر کرتے ہیں اور یہ سارا خرچ عوامی فنڈز سے آتا ہے۔ بولے ہمیں اخراجات کا قانونی حق ہے۔ اس سلسلے میں اکثر لیڈران کی مہمان نوازی کا کام بھی حلیم کے سپرد ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آزاد کشمیر کے سابق صدر اور اپوزیشن لیڈر نارتھ امریکہ میں اپنی جماعت کی تنظیم سازی کیلئے تشریف لائے تو مانٹریال میں راقم نے اپنے گھر میں دعوت پر بلایا۔ پاکستان کمیونٹی کے جملہ افراد بھی اس دعوت میں شریک تھے۔ موصوف انتہائی دیانتدار اور سادہ طبیعت کے انسان تھے۔ ٹورنٹو دورے کا انتظام ہم نے کروایا۔ اور اسکے بعد نیویارک میں انکو ایئرپورٹ سے لانے اور رہائش کے انتظامات راجہ حلیم صاحب نے کیئے۔ انکو راقم نے فون کیا کہ جنرل صاحب آرہے ہیں۔ فوراً موصوف نے سارے انتظامات کیئے۔ اور فون کر کے بتایا کہ جنرل صاحب کو کہیں ایئرپورٹ پر ہمارا انتظار کریں۔ راجہ حلیم اس سلسلے میں ان لیڈران کے سارے حالات سے واقف تھے۔ کئی دفعہ میں نے انکو بتایا کہ حلیم صاحب بیکار میں رقم ضائع نہ کریں۔ کہنے لگے چلو راجہ صاحب اسی بہانے ہم مظاہرے میں لوگوں کو بلالیتے ہیں۔ اور کبھی مسئلہ کشمیر کے بارے میں اپنی ترجمانی کر لیتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں نہ انکے

پاس کچھ ہے اور نہ ہی یہ لوگ کچھ کرنے کے اہل ہیں۔ حلیم صاحب ان لوگوں میں سے ہیں کہ کوئی کشمیر کے بارے میں کچھ کرنا چاہے تو تو وہ ایکدم تیار ہو جاتے ہیں۔ وہ سیاسی نظریات کی طرف نہیں جاتے۔ ایسے جذباتی اور بے لوث لوگوں کی وجہ سے مسئلہ کشمیر زندہ ہے۔ اور ان لوگوں کے نام پر آزاد کشمیر کے بیشتر لیڈران نے اخبارات میں سرخیاں لگوا کر آزاد کشمیر کے سادہ لوح عوام کو لوٹنے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے۔

۱۹۹۰ء کے دوران دو شخصیات نے دیارِ غیر میں مسئلہ کشمیر کو اجاگر کرنے میں خاصا محرّک کردار ادا کیا۔ اور راقم نے روزنامہ نوائے وقت میں ان دونوں شخصیات کا خصوصی طور پر ذکر کیا۔ میرے چند مضامین کشمیر سنٹر اسلام آباد کے ڈائیریکٹر پروفیسر الف دین ترابی صاحب نے اپنی کتاب ''جہدِ مسلسل'' میں ان مضامین کو شامل کیا۔ ۔ اور مجھے کتاب بھی بھیجی تھی۔ یہ دو شخصیات ڈاکٹر ایوب ٹھاکر ورلڈ کشمیر فریڈم موومنٹ کے چیئرمین اور کشمیر امریکن کونسل کے ڈاکٹر غلام نبی فائی صاحب تھے۔ یہ دونوں افراد پاکستان کے اکثر دورے کرتے رہے۔ اور امریکہ اور کینیڈا میں بھی ان سے ملاقات ہوئی۔ کشمیر کے سلسلے میں ایک مظاہرے میں آٹاواہ کے مقام پر موصوف نے بھی شرکت کی اور مانٹریال یومِ چرار شریف کے سلسلے میں ڈاکٹر ایوب ٹھاکر مانٹریال میں سیمینار سے خطاب کیا اور میرے گھر تشریف لائے۔ دونوں شخصیات مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں کوششیں کرتی رہیں۔ اور میرے چند مضامین نے انکو پاکستان میں بھی خاصا متعارف کروایا۔ ڈاکٹر ایوب ٹھاکر صاحب نے خصوصی طور پر میرا شکریہ ادا کیا۔ مکتوب کینیڈا کے ذریعے میرے مضامین اکثر انکے زیر مطالعہ رہے۔ نظریاتی طور پر دونوں شخصیات کا تعلق مقبوضہ کشمیر جماعت اسلامی سے تھا اور سید علی شاہ گیلانی کے ساتھ انکے قریبی روابط تھے۔ مگر ڈاکٹر فائی صاحب کے کشمیر سے آنیوالے تقریباً تمام ہندو مسلم لیڈران کے ساتھ روابط تھے۔ جنمیں پروفیسر بھیم سنگھ بھی شامل تھے۔ اکثر مجھے ان سب حضرات کے بارے میں رپورٹیں ملتی رہتی تھیں۔ یہ ۱۹۹۰ء کے دورانئے کی بات ہے کہ سیّد مظفر حسین مشہدی سے فون پر رابطہ ہوا۔ کسی نے انکو میرا فون دیا تھا۔ انہوں نے میرے بعض مضامین کا ذکر کیا اور کشمیری لیڈران سے حد سے زیادہ بیزاری کا ذکر کیا۔ انکا کہنا تھا کہ آزاد کشمیر کے ان لیڈران نے کشمیری کمیونٹی کو جاٹ اور راجپوت میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک انتہائی منظّم لشمیری آبادی کو قبیلوں میں تقسیم کر کے یہ لیڈران انکو دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے ہیں۔ اور کشمیر کیلئے ہماری متحدہ جدوجہد کو یہ لوگ نقصان پہنچا رہے ہیں۔ بلکہ میں یہ کہونگا کہ یہ لیڈر ہندوستان کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ موصوف نے دعوت دی کہ انکی تنظیم تحریک کشمیر برطانیہ، برمنگھم میں کانفرنس کا اہتمام کر رہی ہے۔ اسلئے اگر آپکے پاس وقت ہو تو تشریف لائیں۔ اس وقت ہم نے اپنا سٹور فروخت کر دیا تھا اور کسی نئ جگہ کاروبار کرنے کا پروگرام بنا رہے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ہمراہ نیاگرا فالز کی سیر کا پروگرام بنایا اور وہاں سے لندن کیلئے روانہ ہو گئے۔ یہ میرا کینیڈا کا پہلا دورہ تھا۔ ہم نے چند دن ہیتھرو اِن میں گذارے اور پھر راجہ اشراف صاحب آف پس جھولہ کے ہاں ساؤتھ ہال چلے گئے۔ جہاں انکا گھر بھی تھا اور کاروبار بھی تھا۔ وہ میرے کلاس فیلو بھی رہے تھے اور ہمارے رشتہ دار بھی تھے۔ انکے ہاں کھانا کھایا اور انکو بتایا کہ ہم ایک ماہ تک لندن رہنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ پھر دوسرے شہروں کا دورہ کریں گے۔ انکے والد راجہ محمد زمان خان میرے والد کے دوست تھے اور برٹس سفارت خانہ اسلام آباد میں کام کرتے تھے۔ ریٹائر ہونے

کے بعد ہائی کمشنر نے انکو خاندان سمیت امیگریشن کروا دی۔ یہاں آ کر انہوں نے ایک دوکان خریدی اور حلال گوشت کا کام شروع کیا۔ جو خاصا کامیاب رہا۔ اچھا مکان خرید لیا اور کاروبار نے بھی خوب ترقی کی۔ بہت خوش ہوئے۔ انہوں نے اپنے ہاں رہنے کا مطالبہ کیا۔ مگر ہم نے معذرت کر دی۔ پھر ان ہی کے کہنے پر پنجاب کے جس خاندان کا ذکر کیا ہے۔ وہاں کمرہ لیا۔ چند دنوں تک ہم لندن کی سیر کرتے رہے۔ بکنگھم پیلس دیکھا۔ ڈاکٹر ایوب ٹھاکر کے منسلول روڈ والے دفتر میں گئے۔ وہاں کافی دیر انکے ساتھ رہے اور مسئل کشمیر اور دیگر امور پر ان سے بات چیت ہوتی رہی۔ انکا کہنا تھا کہ آزاد کشمیر کے لیڈران میں سے بعض کشمیر کے حدود اربعہ سے بھی پوری طرح واقف نہیں ہیں۔ وہ مسئلہ لشمیر سے نہ ہی کوئی دلچسپی رکھتے ہیں اور نہ ہی انکو کچھ کرنے کی اجازت ہے۔ وہ صرف سیر و سیاحت کیلئے دیارتِ غیر کا چکر لگاتے ہیں اور آزاد کشمیر کے سادہ لوح افراد کو بیوقوف بنا کر چندہ اکٹھا کر کے لے جاتے ہیں۔ اور یہی صورت حال مقبوضہ کشمیر کی ہے۔ موصوف اس سلسلے میں ایک راہنما کا ذکر کر رہے تھے۔ جب وہ سعودی عرب میں تھے اور ایک میٹنگ کے بعد شام کو موصوف بھارتی سفارتخانہ کی دعوت میں شریک تھے۔ مگر مقبوضہ کشمیر میں وہ کشمیر کے سلسلے میں بیرون ملک کے دورے کے بارے میں میڈیا میں رپورٹیں دے رہے تھے۔ دوسرے دن جب میں نے انکو فون کیا تو ڈاکٹر صاحب بتا رہے تھے کہ موصوف نے فون نہ اٹھایا۔ انہیں علم تھا کہ میں ان سے اس استقبالیہ تقریب کے بارے میں لازمی سوال کرونگا۔ انکا کہنا تھا کہ کشمیریوں کے ساتھ یہ کاروبار دہلی اور اسلام آباد دونوں طرف جاری ہے۔ لیڈرشپ دیانتدار ہو تو کبھی یہ بحران پیدا نہیں ہوتا۔ اور اتنا ظلم کشمیریوں پر نہ ہوتا۔ اسی دوران ساؤتھ ہال میں ایک کشمیری کمیونٹی کی تقریب تھی۔ شائید اسمین سیّد منور حسین مشہدی صاحب آئے تھے۔ میں راجہ اشرف صاھب کے سٹور پر گیا۔ جہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ ان سے خط و کتابت تو ہوتی تھی مگر یہ ہماری پہلی ملاقات تھی۔ ساتھ ہی ریٹورنٹ میں گئے۔ جہاں ہم نے چائے پی۔ یہ لاہور ریسٹورنٹ تھا۔ جو شائید ہمارے آزاد کشمیر کے ہی تھے۔ موصوف سے بہت سے امور پر بات چیت ہوئی اور میں نے ان سے وعدہ کیا کہ کانفرنس میں ضرور شرکت کرونگا۔ ڈاکٹر ایوّب ٹھاکر صاحب بھی شرکت کر رہے تھے۔ چنانچہ ایک ہفتے بعد میں اپنی اہلیہ اور بیٹی کے ہمراہ برمنگھم میں تھا۔ انکے ساتھ مجھے یاد ہے ایک نوجوان محمد غالب صاحب تھے۔ جو آجکل تحریک کشمیر یورپ کے چیئرمین ہیں۔ منورّ حسین مشہدی صاحب نے انکی ڈیوٹی لگائی کہ ان کیلئے عارضی طور پر مکان کا بندوبست کریں۔ مکان خالی کروایا گیا۔ مگر میں نے معذرت کر لی۔ اور میں برمنگھم کے ایک ہوٹل میں چلا گیا۔ ۔ سامان وہاں رکھا اور دوسرے دن ہم سیمینار میں شرکت کیلئے آئے۔ اس دوران چند وزاراء بھی آئے ہوئے تھے۔ مگر مشہدی صاحب نے انہیں دعوت نہیں دی۔ وجہ یہ تھی کہ وہ مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے آنا چاہتے تھے۔ اور تنظیم نے انکو اجازت نہیں دی۔ یہ ایک معیاری اجتماع تھا۔ راقم کے علاوہ ڈاکٹر ایوب ٹھاکر صاحب۔ سید منور حسین مشہدی صاحب اور دیگر بہت سے مقرّرین نے خطاب کیا۔ کشمیر میں ہونیوالی زیادتیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی۔ میڈیا کے بھی بعض اراکین موجود تھے۔ اجتماع کے بعد ہم ہوٹل میں آ گئے۔ دوسرے دن سیّد منور حسین مشہدی صاحب کے ساتھ میری نشست تھی۔ وہ صبح ناشتے پر آئے اور ہم نے سارے معاملات پر بات چیت کی۔ وہ ایک عرصے سے یہاں پر مقیم تھے۔ ایک کتابخانہ چلاتے تھے۔ اور کشمیر کے معاملات پر پورے انگلینڈ میں رابطہ رکھتے تھے۔ اور مسئلہ کشمیر اجاگر کرنے کا جذبہ تھا۔ انہیں کسی شہرت کی ضرورت نہ تھی۔ اور نہ ہی وہ اس جدوجہد کا

کریڈٹ حاصل کرنے کیلئے تگ ودو کررہے تھے۔ انکا کہنا تھا کہ لندن میں کشمیری کمیونٹی کی خاصی تعداد آباد ہے۔ اور اگر انکو متحد کرکے آگے بڑھایا جائے تو اسکے اثرات پورے یورپ پر پڑ سکتے ہیں۔ مگر آزاد کشمیر کی لیڈرشپ یہاں کے لوگوں کو تقسیم کرکے کاروبار چلا رہی ہے۔ مشیر کے عہدے پہلے ہی سے تقسیم کیئے جاتے ہیں اور اس کے عوض یہ لیڈر کروڑوں روپے ایڈوانس اپنے جماعت کے فنڈز کیلئے لے رہے ہیں۔ جبکہ یہ سارا فنڈ انکے اپنے اکاؤنٹ میں جارہا ہے۔۔ اس سلسلے میں انکی مایوسی دیدنی تھی۔ ڈاکٹر ایوب ٹھاکر صاحب کی بھی یہی شکایات تھیں۔ انکا کہنا تھا کہ بیس کیمپ کی ایک نمائیندہ حکومت اور لیڈرشپ ہونی چاہیئے تھی۔ مگر ایسا نہیں ہوسکا۔ موصوف اس سے قبل پاکستان کے اہم لیڈران سے مل چکے تھے۔ بہرحال اس دوران میری تحقیقات کا سلسلہ جاری رہا اور میرے چند مضامین میرے دورے کے سلسلے میں نوائے وقت اور ہفت روزہ کشمیر میں شائع ہو چکے تھے۔ جس پر مختلف جماعتوں کے راہنماؤں نے لندن میں ہی راقم سے رابطہ قائم کیا اور لیڈران حضرات کی طرف سے ردِّعمل کی رپورٹ دی جو میرے لئے کوئی نئی بات نہیں تھی۔ کیونکہ یہ آزاد کشمیر کی مقدس گائیں بن چکی تھیں۔ جن پر تنقید کرنا گناہ تھا۔ سیّد نذیر گیلانی انسانی حقوق کے عالمی ترجمان ہیں اور مسئلہ کشمیر پر انکے مقالات اور رپورٹیں اکثر آتی رہتی ہیں۔ انکے ساتھ بھی لندن اور اسلام آباد ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

اس سارے عرصے میں ایک بات شدّت سے محسوس کی گئی کہ آزاد کشمیر میں سیاست کا محور صرف کشمیر ہاؤس کی عیّاشیاں ہیں۔ اس سلسلے میں ساری رپورٹیں جو لندن، برمنگھم اور ناٹنگھم سے ملتی رہیں۔ اسی کے مطابق آزاد کشمیر کے لیڈران نے محض ذاتی شہرت کیلئے مختلف سیمیناروں میں ایسے اداروں کی سرپرستی میں شرکت کی جنکا کشمیر مخالف عناصر سے تعلق تھا۔ بلکہ بعض ''را'' سے فنڈز وصول کرتے تھے۔ بیرسٹر سلطان محمود، سردار عتیق احمد اور انکے والد سب اپنے اپنے ادوار میں انہی ذاتی شہرت کیلئے ہر وہ ہتھکنڈہ استعمال کرتے رہے۔ جس سے انکو پاک اور انڈین میڈیا میں پذیرائی حاصل ہو۔ حقیقی معنوں میں انکا کشمیر کی عوام کے حقوق کیلئے سب کردار ایک مداری کی آنکھ مچولی سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

برمنگھم میں قیام کے دوسرے روز ایک دن نیچے ڈیسک سے فون آیا کہ راجہ اعظم صاحب آئے ہیں۔ انکا نام سن رکھا تھا۔ وہ مسلم کانفرنس برطانیہ کے صدر رہے ہیں۔ اور ایک عرصہ سے مسلم کانفرنس کے لیڈران کا لندن میں استقبال کرتے رہے ہیں۔ اور ناٹنگھم میں انکا کشمیر ہاؤس استقبالیہ تقریبات کا مرکز رہا ہے۔ آزاد کشمیر کے کسی شخص نے انکو بتایا اور وہ سیدھے ہوٹل پہنچے۔ میں نیچے لابی میں آیا تو ایسا لگا سردار قیوم صاحب کہیں سے آ گئے ہیں۔ انکی شکل اور بات چیت بالکل سردار صاحب سے ملتی جلتی تھی۔ میں ایک دن اور برمنگھم رہنا چاہتا تھا کیونکہ چند اور ساتھی ملنے کے خواہش مند تھے۔ مگر انہوں نے مجھے مجبور کیا۔ کہنے لگے۔ میری بیگم کھانا تیار کررہی ہے۔ آپ کو ابھی چلنا ہوگا۔ ہوٹل کا بل ادا کیا اور ہم ان کے ساتھ ہو لئے۔ ناٹنگھم میں انکا گھر خاصا بڑا تھا۔ انہوں نے چند دوسرے افراد کو بھی دعوت دی تھی۔ انتہائی مخلص اور شریف انسان تھے۔ چوہدری غلام عباس مرحوم سے بھی مل چکے تھے۔ نظریاتی طور پر مسلم کانفرنس سے وابستہ تھے۔ جب بھی مسلم کانفرنس کا کوئی لیڈر آتا تو لندن شہر کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہونے کے بعد سیدھا ناٹنگھم کا رخ کرتا۔ اور یہاں استقبالیہ تقریبات ہوتیں۔ بیک وقت کئی سو افراد کا اجتماع ہوتا۔ کھانے تیار ہوتے۔ سردار عبدالقیوم صاحب خطاب فرماتے اور نعروں کی گونج میں کشمیر فتح کرنے کی باتیں ہوتیں۔ چندہ جمع ہوتا اور روانگی کے وقت سردار صاحب کو پیش کیا جاتا۔ میں نے راجہ

اعظم صاحب کو انتہائی افسردہ پایا۔ کہنے لگے۔ ساری زندگی ان لوگوں کی خدمت کی۔ جب سرمایہ ختم ہوگیا تو ان لوگوں نے ادھر دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ کسی کام کیلئے باہر گئے تھے تو انکی بیگم آکر بیٹھ گئیں۔ انکی آنکھوں میں آنسو تھے۔ کہنے لگیں۔ آپ میرے بیٹے کی طرح ہو۔ آپ ان لیڈروں کو جانتے ہو جیسا کہ راجہ صاحب نے مجھے بتایا تھا۔ برائے کرم آپ ان سے کہیں کہ اب انکا پیچھا چھوڑ دیں۔ ہمارے بچے پڑھ رہے ہیں۔ سارا اثاثہ انہوں نے ان کیلئے وقف کردیا۔ بینکوں سے قرضہ لیکر انکو استقبالیہ دیتے رہے۔ یہ لوگ سرکاری فنڈز سے کروڑوں روپے لیکر آتے ہیں اور یہاں آکر سب خرچ۔ راجہ صاحب جیسے لوگوں کو یہ لوگ استعمال کرتے ہیں اور جب وہ پاکستان جاتے ہیں تو ان لوگوں کے پاس راجہ صاحب کیلئے ملاقات کا وقت نہیں ہوتا۔ پھر یہ لوگ نیا گاہک تلاش کرتے ہیں۔ اور یوں کسی اور کی زندگی یوں تباہ ہوگی۔ بیٹا۔ یہاں کئی لوگوں کی بیویاں انکو ان لیڈران کی وجہ سے چھوڑ گئیں۔ گھر میں دس پاؤنڈز زیادہ خرچ ہو جائیں تو آسمان سر پہ اٹھا لیتے ہیں۔ مگر ان لیڈران کو ہزاروں پاؤنڈ چندہ دیتے ہیں۔ خیر میں نے راجہ صاحب کی بیگم کی بات تو نہ کی مگر شام کو جب ہم بیٹھے تو راجہ صاحب نے خود ہی بات شروع کردی کہ وہ کب سے مسلم کانفرنس کیلئے کام کرتے آئے ہیں۔ پھر جب موجودہ قیادت تک بات پہنچی تو کہنے لگے۔ سردار صاحب نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ آپکو میرپور سے اسمبلی کا ٹکٹ دونگا۔ آپ ذرا مسلم کانفرنس کیلئے فنڈ اکٹھا کریں تاکہ الیکشن میں ہم دوسری جماعتوں کا مقابلہ کرسکیں۔ کہنے لگے چندہ کے علاوہ دیگر اخراجات کے بارے میں بات ہی نہ کریں۔ پھر اور تفصیلات بتانے کے بعد کہنے لگے جب الیکشن کا وقت آیا تو میں پاکستان گیا۔ سردار صاحب نے مصروفیات کا بہانہ بنا کر ملاقات کا وقت ہی نہ دیا۔ مسلم کانفرنس کے ٹکٹ کی بات تو دور کی رہی۔ پھر ان دونوں لیڈران سردار سکندر صاحب اور انکے درمیان تعلقات اچھے نہیں تھے۔ سردار انکو مسلم کانفرنس سے الگ کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ انکی موجودگی میں انکے بیٹے کیلئے راستہ بنانا مشکل تھا۔ چنانچہ سردار سکندر کو اس صورت حال کا بخوبی علم تھا۔ یہاں برطانیہ میں سردار صاحب اکثر اپنے بیٹے کے بارے میں بات کرتے رہتے تھے۔ کہ اب نئی قیادت کا وقت آ گیا ہے۔ آپ سردار عتیق کا تعاون کریں۔ میں نے وہاں جب مسلم کانفرنس کے ایک اہم لیڈر سے بات کی تو انہوں نے مسکرا کر کہا۔ راجہ صاحب! وقت ضائع نہ کریں۔ یہاں جماعت کا ٹکٹ اسکو ملیگا جو زیادہ رقم ادا کرنے کی پوزیشن میں ہوگا۔ یہاں جماعتی کارکردگی نہیں دیکھی جاتی۔ یہاں ڈالروں اور پاؤنڈوں کی تھیلیاں بولتی ہیں۔ آپ نے جو پیسہ ضائع کردیا اسے جواء سمجھ کر بھول جائیں اور عزت بچا کر یہاں سے چلے جائیں۔ پھر انکے مطابق مسلم کانفرنس میں ایسے افراد کو لایا گیا جو چندہ کی رقم دوگنی ادا کرسکیں۔ یہاں کشمیری راجپوت، جاٹ اور چوہدری میں تقسیم کردیئے گئے۔ چوہدری نور حسین خان اپنی برادری کو لُوٹ کر اپنا تخت سجا گئے۔ ہمارے سیدھے سادے میری طرح اپنی غلطیوں پر رو کر چُپ ہو گئے۔ اب دوسری نسل ان خاندانوں کو لُوٹنے کیلئے نئے طریقے لیکر آئیں گے۔ کشمیر کاز کیلئے کام کرنے والے تو اپنے کاموں میں لگ گئے ہیں۔ مگر جو دولت یہ لیڈر لُوٹ کر لے گئے۔ اگر یہ رقم کشمیر کاز پر خرچ کی جاتی تو ہم برطانیہ کے وزیر اعظم کو اپنا ہمنوا بنا سکتے تھے۔

ہم ایک دن انکے ساتھ رہے۔ بہت سی ایسی باتیں جو انہوں نے کشمیری لیڈران کی غیر اخلاقی حرکات کے بارے میں کیں، ان کو سامنے لانا مناسب نہیں۔ مگر مجھے ان سے ملکر انتہائی مایوسی ہوئی اور سیّد منور حسین مشہدی اور ڈاکٹر ایوب ٹھاکر صاحب کی باتوں کے بارے میں مزید تحقیقات کرنے کا موقع

ملا۔اسی دوران میرے مضامین پاکستان کے مختلف اخبارات میں شائع ہوتے رہے۔بعض نے مضامین شائع کرنے سے معذرت کی۔انکا کہنا تھا کہ ہمیں بلوں کی ادائیگی رک جائیگی۔مگرہفت روزہ کشیر،نوائے وقت اورایک نامور کشمیری صحافی میرعبدالعزیز صاحب مرحوم سے میرارابطہ رہا۔اورمسئلہ کشمیر پران کو جو اطلاعات مل سکتی تھیں،فراہم کرتا رہا۔اس دوران جب بھی پاکستان جانے کا اتفاق ہوا تو تمام لیڈران سے ملاقات ہوتی رہی اورانکے گلے شکوے بھی جاری رہے۔

مسئلہ کشمیراورکشمیر کمیٹی کا مذاق

ہمارے ایک انتہائی قریبی ساتھی ڈاکٹر مطلوب حسین صاحب یہاں مانٹریال کے ڈاسن کالج میں شعبہ معاشیات کے پروفیسر تھے۔ایک اچھے شاعر تھے۔انکا تعلق مقبوضہ کشمیر سے تھا مگر سارا خاندان پشاوراور کراچی وغیرہ میں آباد تھا موصوف مقبوضہ کشمیر سے مظفرآباد آئے اور پھرآزاد کشمیر میں کچھ عرصہ لیکچرار کے فرائض سرانجام دیئے۔اور مانٹریال میں اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں آئے اور یہاں کے ہی ہوکر رہ گئے۔ امریکن خاتون سے شادی کی اورانکے دو بچے تھے۔مانٹریال میں میرے شہر کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔انکا کشمیر ریسٹورنٹ ہوا کرتا تھا۔اوروہ اکثران سے ملتے رہتے تھے۔جب میں نے مانٹریال میں قدم رکھا تو ان سے ایک دو بار رابطہ ہوااور پھر جب ایک دن میں نے انکو بتایا کہ میں انسانی حقوق کی تنظیم بنانا چاہتا ہوں تا کہ کشمیر کے مسئلے کو آگے بڑھایا جاسکے۔بہت خوش ہوئے۔کہنے لگے۔میں چونکہ کالج کا پروفیسر ہوں۔عہدہ نہیں لے سکتا۔کیونکہ یہاں ہندومسلمان سب طالبعلم ہیں۔اور چند ہندو پروفیسر بھی ہیں۔اسلئے میں سیاست میں ملوّث نہیں ہوسکتا۔مگر آپ کی مدد ضرور کرونگا۔چنانچہ جب میں نے کام کی ابتدا کی تو اکثر ممران پارلیمنٹ کے ساتھ ملاقاتوں میں ہم ایک ساتھ جاتے۔اورمسئلہ کشمیر پران سے بات چیت ہوتی۔کینیڈین وزیر خارجہ سے بھی دو دفعہ ملاقات ہوئی۔مگر اس سلسلے میں ایک دفعہ ہماری تفصیلی ملاقات سٹیفن ڈیان سے ہوئی جو لبرل پارٹی کی اہم شخصیت تھے۔اور ہمارے حلقہ کے ممبر پارلیمنٹ تھے۔میں نے انکو کشمیر پر چند کتابیں تحفہ کے طور پر دیں۔باتوں باتوں میں موصوف نے صاف کہہ دیا۔کشمیر کے سلسلے میں دونوں ملکوں پاکستان اور ہندوستان کو پہل کرنی ہوگی۔جبتک یہ دونوں ملک آگے بڑھ کر پیش رفت نہیں کریں گے۔اس وقت تک مسئلہ کشمیر کا حل ممکن نہیں۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ کوئی بھی عالمی طاقت دو ایٹمی ملکوں کے درمیان مذاکرات کے سوا اور کوئی خطرہ مول نہیں لے گی۔اور آپ لوگ بیشک آواز بلند کرتے رہیں،یہ آپکا حق ہے۔مگر جبتک کوئی مئوثر طاقت آپکی مدد نہیں کریگی اس وقت تک دنیا نوٹس نہیں لے گی۔دنیا اس وقت نوٹس لیتی ہے۔جب عالمی امن کو خطرہ لاحق ہو جائے۔اب پاکستان اورانڈیا اگراس مسئلے پرکھل کر امن کی بحالی کی کوشش نہیں کرینگے تو ایک وقت آئیگا جب یہ مسئلہ بین الاقوامی تصادم کی طرف جائیگا۔ایسی صورت میں دونوں ملکوں کو آگے بڑھ کر اس تصادم سے بچنے کیلئے اس مسئلے کا حل نکالنا ہوگا۔مگر فی الحال یہ مسئلہ عالمی بحران کا باعث نہیں بن سکا۔گویا ان کے خیال میں کوئی بھی مسئلہ اس وقت توجّہ مانگتا ہے جب عالمی مالیاتی اداروں کیلئے نقصان کا خطرہ ہو۔ڈاکٹر مطلوب حسین صاحب معاشی معاملات کے ماہر تھے۔جب ان سے میٹنگ ختم ہوئی تو باہرآ کر موصوف بولے۔راجہ صاحب یہ شخص انتہائی سچا انسان ہے۔ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔واقعی عالمی مالیاتی نظام ہی دنیا کو کنٹرول کرتے ہیں۔دنیا کے چند خاندان بڑی طاقتوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔اورجبتک ہندوستان

اور پاکستان ان عالمی اداروں کے کنٹرول میں ہیں۔اس وقت تک کشمیر کا مسئلہ اسی طرح رہیگا۔لوگ مرتے رہینگے۔جس دن یہ آگ ان عالمی اداروں کے سرمایہ کو لپیٹ میں لے گی۔اس دن مذاکرات کی ٹیبل پر پاکستان اورانڈیا دونوں ہونگے۔

پاکستان میں بھی مسئلہ کشمیر کو ایک مذاق سمجھا گیا۔ایک ہزار سال تک کشمیر کیلئے جنگ لڑنے کا اعلان کرنیوالے ذولفقارعلی بھٹو نے شملہ معاہدہ کر کے اسکو دو ملکوں کا مسئلہ بنا دیا۔پھر یہ مسئلہ ایک مذاق سے زیادہ کچھ نہ تھا۔لوگ دونوں طرف مرتے رہے۔اور پاک بھارت سرحد پر فوجی ایک دوسرے کو قومی تہواروں پر مٹھائیاں دیتے رہے۔یہ میں نہیں کہہ رہا۔بلکہ ایک ریٹائرڈ ملٹری آفیسر مجھ سے کچھ سال قبل کہہ رہا تھا۔پاکستان کی قومی اسمبلی میں کشمیر کمیٹی بنائی گئی تا کہ مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر اٹھا سکیں اور پاکستان کی قومی اسمبلی میں اس مسئلہ کو پیش کیا جاسکے۔اس سلسلے میں پاکستان کے ایک اپوزیشن لیڈر نوابزادہ نصر اللہ خان کو کشمیر کمیٹی کا چیئرمین بنایا گیا۔یہ صرف انکا منہ بند کرنے کیلئے کیا گیا۔ورنہ وہ ضعیف العمر تھے۔ یوروپ کے دورے کے دوران ایک دوست نے فون کیا۔یار راجہ صاحب۔وہ ایک جگہ تقریر کر رہے تھے۔مجھے تو انکی باتوں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی۔انکا منہ بند کرنے کیلئے انکو چیئرمین بنایا گیا اور اسکا اظہار موصوف نے بھی ایک دفعہ کیا کہ پالیسی کشمیر کمیٹی نہیں بناتی۔پالیسی حکومت بناتی ہے۔بہرحال موصوف کشمیری راہنماؤں سے ضرور ملتے رہے۔اورایک سیاستدان کی حیثیت سے موصوف نے اپنی طرف سے یہ ضرور کوشش کی کہ کشمیری راہنماؤں سے روابط بڑھائے جائیں۔اوراس سلسلے میں آزاد کشمیر کے بیشتر لیڈران کے ساتھ باقاعدہ کشمیر کی صورت حال پر مشورہ کیا اوراس سلسلے میں حکومت پاکستان کو مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں آزاد حکومت کو زیادہ اختیارات دینے کی سفارش کی گئی۔مگرانکے پاس اختیارات نہیں تھے۔ وہ صرف سفارش کر سکتے تھے۔اورنہ ہی وہ عالمی میدان میں کوئی اہم کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں تھے۔ مجھے یاد ہے کہ لندن کے اہم کشمیری لیڈران بھی کہہ رہے تھے۔کشمیر کمیٹی کا چیئرمین اگر کشمیری ہوتا تو اسکا کوئی اثر ہوتا۔آخری عمر میں بوڑھے بابا کو کشمیر کمیٹی کا چیئرمین بنا کر کونسا حکومت پاکستان نے تیر مارا ہے۔اس سلسلے میں بین الاقوامی میدان میں کام کرنیوالے کشمیری راہنماؤں کو ہمیشہ یہ شکوہ رہا ہے کہ پاکستان کیلئے کام کرنیوالے سفارتکاروں کو کشمیر کے بارے میں ہمیشہ گومگو کی پالیسی میں مبتلا رکھا ہے۔اور انکو صحیح طریقے سے کام نہیں کرنے دیا گیا۔اس سلسلے میں سفارتکار حضرات اکثر شکایات کرتے رہے کہ ہم فارن آفیسرز کی اجازت کے بغیر کوئی اپنی پالیسی بنانے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔اکثر لوگ پاکستان کے سفارتکاروں کو مورد الزام ٹھہراتے ہیں۔مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ پالیسیاں اسلام آباد میں بنتی ہیں۔ سفارتکار نہیں بناتے۔

حرّیت کانفرنس ۱۹۹۰ء کے دوراہے میں ایک نمائندہ جماعت

حرّیت کانفرنس ۱۹۹۰ء کے دور میں ایک نمائندہ جماعت بن کر ابھری اور تقریباً تمام تنظیمیں کشمیر کے مسئلہ پر یکجا ہوکر آواز اٹھانے لگیں۔اسکے اثرات بھی عالمی سطح پر پڑنے لگے۔بھارت سرکار کو یہ بات قبول نہیں تھی۔چنانچہ ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت حریّت کانفرنس کو تقسیم کرنے کا پروگرام کیا گیا۔اس سلسلے میں جنرل پرویز مشرف پر زبردست دباؤ ڈالا گیا کہ وہ سیّد علی شاہ گیلانی کو حرّیت لیڈرشپ سے ہٹانے میں مدد دیں۔جنرل پرویز مشرف ویسے بھی عالمی سطح پر جمہوری حکومت کا تختہ الٹنے کی وجہ سے

خاصے بدنام تھے۔ اسلئے جب وائٹ ہاؤس کا دباؤ پڑا تو موصوف نے سردار عبدالقیوم خان کی اس سلسلے میں خدمات حاصل کیں۔ اطلاعات کے مطابق انکے ایک مشیر اس سلسلے میں سردار صاحب کے معاون بنے۔ اور سردار صاحب کو سیر سپاٹے کیلئے کھلے فنڈز مہیا کئے گئے۔ جنرل صاحب چونکہ اپنی پوزیشن مضبوط بنانا چاہتے تھے۔ اسلئے نیویارک میں ایک کشمیر کانفرنس کا اہتمام کیا گیا جسمیں میر واعظ عمر فاروق صاحب کو دعوت دی گئی۔ حکومت ہند کی ملی بھگت سے میر واعظ صاحب نے نیویارک کا سفر کیا۔ انکے ہمراہ ایک انڈین اخبار کے سابق ایڈیٹر اور ایک انڈین مسلمان صحافی بھی آئے تھے۔ جو غالباً حکومت ہند کی نگرانی میں آئے تھے۔ اس سلسلے میں نیویارک میں کانفرنس کے دوران بھی ایک کشمیری راہنما نے اشارہ دے دیا تھا کہ حرّیت کانفرنس کے دن گنے چُنے رہ گئے ہیں۔ کیونکہ دہلی اور اسلام آباد میں حرّیت کانفرنس کو تقسیم کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا ہے۔ میری سردار عبدالقیوم صاحب سے فون پر بات ہوئی۔ موصوف کو ہم نے مانٹریال آنے کی دعوت دی۔ میرے چند ساتھی ایک پروگرام رکھنا چاہتے تھے۔ موصوف میری تحریروں سے خاصے ناراض تھے۔ اسلئے معذرت کردی۔ مانٹریال سے انکو کچھ ملنے والا نہیں تھا۔ اس دوران وہی صحافی مانٹریال تشریف لائے تو انڈین لابی نے انکو دعوت دی۔ مسلمان تھے۔ ایک صاحب نے جنکا تعلق یہاں کی ایک ساؤتھ ایشین تنظیم سے تھا۔ میرا ان سے رابطہ کروایا۔ کہنے لگے۔ دونوں طرف کے لیڈران کشمیر میں طاقتور نمائیندہ جماعت کے خلاف ہیں۔ اور سیّد علی شاہ گیلانی سے انڈیا کو ہمیشہ خطرہ رہا ہے۔ اور اب حرّیت کانفرنس چونکہ کشمیریوں کی آواز بنتی جارہی ہے اسلئے بہت سے بھارت نواز کشمیری لیڈران بھی اس سلسلے میں دونوں طرف کے لیڈران کے ساتھ ہیں۔ بہر حال فیصلہ ہو چکا ہے۔ دیکھئے اس پر پیش رفت میر واعظ عمر فاروق کے سرینگر جانے کے بعد ہی ہوگی۔

اس سلسلے میں مشاہد حسین سیّد جو ایک صحافی اور سیاسی راہنما بھی ہیں۔ مشرف سرکار کی حکومت کے دوران انکے مشیر تھے اور بھارت سرکار اور پاکستان کے درمیان پُل کا کام سر انجام دیتے رہے۔ اطلاعات کے مطابق چند اہم شخصیات انکے قریبی دوست تھے۔ جو بھارتی حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے۔ اور وہ اس مشن میں حرّیت کانفرنس میں کمزور لیڈرشپ کو لانے اور عالمی میدان میں کشمیریوں کی آواز کو کمزور کرنے میں موصوف نے اہم فرائض سرانجام دیئے۔ اور مشرف سرکار کے قریب ترین مشیروں میں انکا شمار ہوتا تھا۔

۱۹۹۰ء کے دوراہے میں اسلام آباد میں دو اہم شخصیات سے میری تفصیلی نشستیں

۱۹۹۰ء کے دوراہے میں آزاد کشمیر کے سابق صدر جنرل محمد حیات خان صاحب اور سردار سکندر صاحب صدر آزاد کشمیر کے ساتھ میری تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔ اس وقت مسلم کانفرنس آہستہ آہستہ اندرونی بحران سے دوچار ہو رہی تھی۔ مسلم کانفرنس کے طاقتور ترین لیڈر سردار عبدالقیوم صاحب، سردار عتیق احمد صاھب کیلئے راستہ صاف کررہے تھے اور انکا مقابلہ دو تاریخی خاندانوں سے تھا۔ ایک چکار مظفر آباد کے راجہ محمد حیدر خانصاحب مرحوم کا خاندان اور دوسرا غازی کشمیر سردار فتح محمد کریلوی کا خاندان۔ دونوں کی مسلم کانفرنس کیلئے خاصی قربانیاں تھیں۔ اور دونوں آزاد کشمیر میں بااثر خاندان تھے۔ چنانچہ یہ دو اہم افراد مسلم کانفرنس کے نشانے پر تھے۔ کیونکہ انکی موجودگی میں سردار صاحب کیلئے پیش رفت کرنا مشکل تھا۔ اس سلسلے میں میری بات چیت خواجہ عبدالصمد وانی مرحوم سے بھی رہی۔ انکے ہفت روزہ کے ساتھ میرا قریبی

تعلق تھا۔ دوسرت جنرل محمد حیات خان صاحب تھے۔ جن کے ساتھ میری اکثر نشست ہوتی رہی تھی۔ میری والدہ محترمہ کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اسلئے علاج کیلئے انکو اپنے ساتھ لایا تھا۔ خاصا وقت تھا۔ چنانچہ انسانی حقوق کی بھاری خلاف ورزی اور پاکستان اور کشمیری لیڈران کی سرگرمیوں پر خاصی بات چیت ہوتی رہی۔ میری چند نشستیں صدر آزاد کشمیر سردار سکندر حیات صاحب سے ہوئیں۔ کیونکہ میں امیرِ شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی کے بارے میں کتاب لکھ رہا تھا۔ موصوف سے ان نشستوں میں غازی کشمیر سردار فتح محمد کریلوی صاحب کی امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی کے ساتھ اس جدوجہد میں شرکت اور پونچھ عوام کے حقوق کیلئے انکی جدوجہد کے بارے میں انکے لئے خاصا مواد ملا۔ اس دوران مسلم کانفرنس کا بحران سامنے آچکا تھا۔ ایک مضبوط جماعت اندر سے مکمل طور پر ختم ہوچکی تھی۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ غازی آباد والے کسی اور کو آگے نہیں آنے دے رہے تھے۔ اور مسلم کانفرنس کی جنرل کونسل میں اپنے آدمیوں کو لا رہے تھے۔ سردار صاحب کا کہنا تھا کہ مسلم کانفرنس ایک کاروباری ادارہ بن چکا ہے۔ روپوں کے بریف کیس کشمیر ہاؤس میں پہنچ رہے ہیں۔ درجن بھر سڑکوں کی تعمیر کیلئے کروڑوں روپے ٹھیکیداروں کو ادا کئے گئے۔ مگر سڑکیں ویسی کی ویسی ہیں۔ ٹھیکیداروں کے ساتھ ان لوگوں کی شراکت داری ہوگئی ہے۔ ہم لوگوں کو کیا جواب دیں۔ موصوف نے اس سلسلے میں چند سڑکوں کا ذکر کیا جو کاغذات میں ہائی ویز ہیں مگر انکو گدھا روڈ کہا جائے تو مناسب ہوگا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ جناب آپ اس سلسلے میں تحقیقات کا مطالبہ کرسکتے ہیں۔ کہنے لگے۔ وزارت امور کشمیر سے ملی بھگت سے معاملات طے کئے جارہے ہیں۔ انکو اس شراکت داری سے حصہ مل رہا ہے۔ پاکستان کا قومی خزانہ ملی بھگت سے لوٹا جارہا ہے اور آزاد کشمیر کا بُرا حال ہے۔

سردار صاحب کا کہنا تھا کہ سرکاری معاملات میں اخراجات ہوتے ہیں۔ ہمیں سفری سہولیات حاصل ہیں۔ مگر یہاں تو اُلٹی گنگا بہتی ہے۔ ہر سال کئی کروڑ کی گاڑیاں منگوائی جاتی ہیں اور پھر یہ مختلف محکموں کے آفیسران کو کمیشن کے ذریعے فروخت کردی جاتی ہیں۔ انکو مفت میں سرمایہ مل جاتا ہے۔ کہنے لگے ہماری آدھی گاڑیاں پاکستان کی سڑکوں پر چل رہی ہیں۔ کیونکہ حکومتی نمائیندے شہروں میں لاکر فروخت کررہے ہیں۔ ریکارڈ میں بعض اوقات ایکسیڈنٹ ظاہر کرکے بیچارہ گاڑیوں کو ناقابل مرمت قرار دیا جاتا ہے۔

میں اسی دوران لندن سے واپس ہوا تھا۔ وہاں برمنگھم میں کانفرنس میں شرکت کیلئے گیا تھا۔ اس وقت کم از کم پانچ وزیر اور ممبران اسمبلی لندن کے دورے پر تھے۔ موصوف نے بتایا کہ ہر وزیر کم از کم پچیس سے پچاس لاکھ کی رقم آزاد کشمیر کے زکوٰۃ اور ترقیاتی فنڈز سے لیکر جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ یہ لوگ مسئلہ کشمیر اجاگر کرنے لندن جارہے ہیں۔ وہاں کارنر میٹنگ کا انتظام کیا جاتا ہے۔ جہاں لوکل کونسلر یا ممبر پارلیمنٹ کو پرائیویٹ کسی کلب میں کھانے پر بلاکر فوٹو لے لئے جاتے ہیں اور ان تصاویر کو اخبارات میں لگایا جاتا ہے۔ وہاں لندن میں جماعت کیلئے فنڈز اکٹھے کئے جاتے ہیں جو پارٹی کیلئے نہیں بلکہ ان لوگوں کے اکاؤنٹ میں جاتے ہیں۔ کوئی آڈٹ کا نظام نہیں ہے۔ نہ ہی اس سلسلے میں کوئی سوال کیا جاتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہوگئی ہے کہ مسلم کانفرنس کی بنیاد ڈالنے والوں کو راستے سے ہٹایا جارہا ہے۔ آپکو تو معلوم ہوگا کہ جمّوں وکشمیر کی پونچھ جاگیر جو ریاست کہلاتی تھی۔ یہاں پر مسلم کانفرنس کا نام ونشان نہ تھا۔ چوہدری غلام عباس کو تو کوئی شخص جانتا تک نہ تھا۔ پونچھ میں چوہدری غلام عباس مرحوم کی درخواست پر

امیر شریعت نے پونچھ میں اس جماعت کو متعارف کروایا۔ اور بعد ازاں موصوف نے جماعت کی سرگرمیوں میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ اسکی وجہ شائید یہ تھی کہ ہمارے مسلم کانفرنس کے بعض لیڈران نے اقتدار کی دوڑ میں آگے بڑھنے کیلئے اس وقت مرکزی وزیر مسٹر گورمانی کی تابعداری شروع کر دی۔ اسلئے موصوف نے آخری وقت میں مسلم کانفرنس سے مکمل علیحدگی اختیار کر لی۔ موصوف میری والدہ صاحبی کی بہت عزت کرتے تھے۔ کیونکہ توہین قران کے سلسلے میں انکے پونچھ میں بڑے نظاہرے میں موصوف نے اپنے ساتھیوں سمیت شرکت کی تھی اور پونچھ شہر مین انہوں نے امیر شریعت اور انکے ساتھیوں کی رہائش اور کھانے پینے کے انتظام کیلئے استقبالیہ کمیٹی کے چیئر مین تھے۔ ظاہر ہے میرے والد جدو جہد آزادی کے سینیئر راہنما تھے۔ مگر اب یہی لوگ آہستہ آہستہ راستے سے ہٹانا چاہتے تھے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ اب وہ سارا ترقیاتی بجٹ اپنے گھر منتقل کرنے کے خواہش مند ہیں اور ہم ایسا نہیں ہونے دینگے۔ اس دوران محکمہ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹ کے ایک آفیسر مجھے کیپیٹل ہوٹل میں ملے اور مجھے پانچ ماہ کی رقوم کی فہرست دکھائی جو بیرون ملک دوروں پر ہمارے لیڈران نے رقم وصول کی۔ انکے اعداد و شمار کے مطابق پندرہ کروڑ کی رقوم کشمیر کے دوروں کے نام پر نکالی گئیں۔ اور دنیا کو معلوم ہے کہ کشمیر کیلئے ان لوگوں نے جو کیا وہ تو بیرون ملک عیاشیاں کرتے رہے اور میڈیا کو رپورٹ کرتے رہے کہ ہم تیر مار رہے ہیں۔ اور جب واپس آتے تو اپنے کارکنوں کو ایئر پورٹ پر پہنچایا جاتا اور اخباری خبریں بنتیں۔ اس سلسلے میں ہمارے ایک مسلم کانفرنسی لیڈر کا کہنا تھا کہ کارکنوں کو ایئر پورٹ پہنچانے کیلئے کئی دفعہ لاکھوں روپے دیئے جاتے اور کرایہ پر بسیں لی جاتیں۔ یہ کرپشن کی زندہ مثالیں ہیں۔ یہ لیڈر جو فرش پر سونے کے دعویٰ کیا کرتے تھے۔ ان لوگوں نے اربوں کی اقوام ترقیاتی فنڈز سے لوٹیں اور وہ اب بھی مقدس گائیں بنی ہوئی ہیں اور انکی پوجا کی جاتی ہے۔ سردار سکندر حیات صاحب کے بارے میں میں لوگ شکایات ضرور کرتے ہیں۔ مگر موصوف انتہائی ملنسار شخصیّت تھے اور موصوف کا کہنا تھا کہ لیڈر کھاتے تو سب ہیں مگر جو لیڈر سو فیصدی بجٹ اپنے لئے وقف کر دے تو آپ عوام کو کیا جواب دینگے۔ اس سلسلے میں سیسی راہنماؤں سے میری بات چیت ہوئی۔ انکا ایک ہی جواب تھا۔ یہاں ایک سرکاری کلچر بن چکا ہے جو کشمیر کے نام پر تجارت کر رہا ہے۔ اور تجسارت کشمیر کیلئے بیرون ملک دوروں اور فنڈز اکھٹے کرنے اور یہاں سے سرکاری فنڈز لیجانے کیلئے کام آتے ہیں۔ اور اکثر ان فنڈز سے یہ لوگ برطانیہ، سپین، نیویارک اور دوسے یورپین شہروں میں جائیدادیں خریدتے ہیں اور پھر چند سال بعد فروخت کرتے ہیں۔ پھر اسلام آباد میں سفارتکاروں سے دوستیاں بڑھاتے ہیں۔ انکی دعوتیں کرتے ہیں اور پھر بیرون ملک سرکاری وفد کے ساتھ اپنے لڑکوں کو بھیجتے ہیں جو انکو بیرون ملک امیگریشن دینے کے بہانے لاکھوں روپے وصول کرتے ہیں۔ اور انکو یوروپ اور نارتھ امریکہ کے شہروں میں امیگریشن دلواتے ہیں اور ان سے اپنی جماعتوں کیلئے کام کرواتے ہیں اور پھر انکے ذریعے نئے گاہک تلاش کئے جاتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء سے لیکر ۲۰۰۸ء تک بیشمار نوجوانوں کو وفود کے ذریعے سمگل کیا گیا اور انکو باقاعدہ امیگریشن دلوائی گئی۔ جسمیں ریفیوجی سٹیٹس شامل ہے۔

اس بات کا علم بیشمار سیاسی کارکنوں کو ہے۔ انمیں مسلم کانفرنس، پیپلز پارٹی اور دوسری جماعتوں کے کارکن بھی شامل تھے۔ اس سلسلے میں کئی کارکنوں نے بعد ازاں شکایات کیں۔ بہر حال افسوس تو اس بات کا ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود ان لیڈروں نے عوام کو بیوقوف بنائے رکھا۔

۱۹۹۹ء میں راقم کو ایک رپورٹ ملی۔ یہ اس رپورٹ کے مندرجات ہیں۔ جسمیں کہا یا کہ پاکستان کی تاریخ میں سب سے بڑی کرپشن آزاد کشمیر میں ہوئی جہاں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ وزارت امور کشمیر سے ملکر اربوں روپے غبن کئے گئے اور آزاد حکومت نے حصّہ داری کی اور یوں سارے معاملات دبا دیئے گئے۔ اور کسی نے پرواہ نہ کی۔

اس سلسلے میں اس سے قبل جنرل حیات صاحب کا بھی کھلے عام یہ کہہ چکے تھے کہ سردار ط عبدالقیوم نے اربوں کی کرپشن کی ہے اور چوہدری نور حسین نے اس دور میں ۸ کروڑ روپے بینک کھول کر ہضم کئے اور کشمیر کواپریٹو بینک جب کنگال ہو گیا تو ہاتھ صاف کر کے نکل گئے اور ہزاروں غریب لوگوں کی رقوم ہضم کر دی گئیں۔ مگر موصوف بھی مرکز میں حصہ ادا کر رہے تھے۔ اسلئے جب جنرل حیات صاحب نے انکے خلاف کیس کیا اور سردار قیوم خان کی فائل کھولی تو جنرل حیات کو سردار قیوم نے اپنے حلقے میں سڑک بند کر کے روک لیا اور جنرل صاحب پھر بھی باز نہ آئے تو مرکز والوں نے انکو خود ہی راستے سے ہٹا دیا۔ انکو علم تھا کہ سارا پردہ اٹھ جائیگا۔ چنانچہ جنرل حیات خان وہ فائیلیں لئے پھرتے رہے اور جب میرے ساتھ اسکی میٹنگ مانٹریال میں میرے گھر میں ہوئی جب وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ اپنی تنظیم بنانے کیلئے دورے پر آئے ہوئے تھے تو انکی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ دیار غیر میں اپنی تنظیم بنا کر ان لیڈران کی ساری کارکردگی کی رپورٹ حاصل کریں۔ میرے مضامین وہ اکثر پڑھتے تھے۔ کہنے لگے راجہ صاحب انکے خلاف کوئی کاروائی اسلئے نہیں کی جاسکتی کیونکہ پاکستان میں انکے حصہ دار ہیں جو انکو تحفظ فراہم کرتے ہیں۔

چنانچہ متعلقہ رپورٹوں کے مطابق آزاد کشمیر میں مسلم کانفرنس اور پیپلز پارٹی اور ن لیگ کے دور میں بھی کرپشن ہوئی مگر سب سے بڑی کرپشن مسلم کانفرنس اور پیپلز پارٹی کے دورِ حکومت میں ہوئی۔ جسمیں اربوں روپے کا فراڈ کیا گیا۔ ایک اندازے کے مطابق دیارِ غیر میں کرپشن سے ۷۰ ارب روپے کی کرپشن ہوئی۔ ایرا اور سیرا میں ۲۴ ارب روپے کی کرپشن ہوئی۔ واپڈہ میں ۳ ارب روپے کی۔ جبکہ جنگلات، برقیات، معدنیات، ترقیاتی اداروں پر کرپشن کی کوئی حد ہی نہیں۔ اس کے لئے ایک پوری ٹیم بنا کر تحقیقات کی جائے تو بھی کئی سال اس کرپشن کے بارے میں لگ سکتے ہیں۔ جن افراد کے بارے میں رپورٹیں تسلسل سے آتی رہی ہیں۔ انمیں سردار عبدالقیوم خان، چوہدری نور حسین خان، سردار یعقوب خان، چوہدری عبدالمجید خان، برجست طاہر، طارق فاروق، چوہدری عبدالعزیز، ڈاکٹر نجیب نقی، افتخار گیلانی، سردار میر اکبر خان آف باغ، چوہدری رُخسار، فاروق سکندر، چوہدری یٰسین خان، چوہدری پرویز اشرف، چوہدری لطیف اکبر، سردار قمر الزمان خان، اور ایک درجن ممبران اسمبلی شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے دور میں ترقیاتی فنڈز پر ہاتھ کی صفائی دکھائی اور کروڑوں کی رقم ہضم کرتے رہے۔ مگر کسی نے انکے خلاف کاروائی نہیں کی۔ اسکے علاوہ کئی درجن سیکریٹریز، ڈائریکٹرز اور دیگر آفیسران ہیں۔ جو کرپشن کے ماہر تھے۔ بیوروکریٹ حضرات میں مندرجہ ذیل افراد کو ٹاپ لسٹ میں شمار کیا جاتا ہے۔ جنہوں نے خوب کمائی کی۔ انمیں مندرجہ ذیل افراد کے خلاف الزامات کے باوجود انکے خلاف کاروائی نہیں کی۔ کیونکہ حکومت خود ان کے ساتھ مل کر اپنا حصہ وصول کرتی رہی۔ انکے نام یہ ہیں۔

۱۔ فرحت علی میر
۲۔ راجہ امجد پرویز

۳۔فیاض عباسی اور درجن بھر ڈائریکٹر حضرات شامل ہیں۔

ججز حضرات میں: چیف جسٹس خواجہ سعید، چوہدری ابراہیم ضیاء صاحب کے علاوہ درجن بھر دوسرے ججز نے اثاثے انکم سے بہت ہی زیادہ بنا رکھے ہیں۔مگر کسی نے ہاتھ اٹھانے کی جراءت نہیں کی۔ کیونکہ اس حمام میں سب ننگے ہیں۔اس سلسلے میں سردار سکندر حیات صاحب اور راجہ فاروق حیدر صاحب کو بھی اس فہرست میں جگہ دی گئی ہے۔مگر افسوس کا امر یہ ہے۔ باغ اور پونچھ کے دیگر اہم لیڈران کو سنگین الزامات کے باوجود ان سے ایک پائی وصول نہیں کی گئی۔اور نہ ہی کسی نے انکے خلاف کاروائی کی۔ گویا جنرل محمد حیات خانصاحب کا یہ فرمان صحیح نکلا کہ آزاد کشمیر کے لیڈران مافیاء بن چکے ہین جو پاکستان کی مافیاء کے ذریعے اقتدار حاصل کرتے ہیں۔اور ملکر دونوں ہاتھوں سے قومی دولت لُوٹتے ہیں۔اس سلسلہ میں ۱۰۰ سے زیادہ بیوروکریٹس ایسے تھے جن کے خلاف کاروائی کی جاتی تو اربوں کی مالیت کی کرپشن ثابت ہوسکتی تھی۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ کا میرا دوست چشم دید گواہ تھا۔ ہوا یوں کہ پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں وزیرِ اعظم چوہدری سلطان محمود صاحب نے سردار قیوم صاحب کی ایک فائل پر کاروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہوا یوں کہ یہ کیس ایک اہم منصوبے کا تھا جسمیں کھلے عام کرپشن کی گئی اور اسمیں انکے فرزند بھی شریک تھے۔ بیرسٹر سلطان صاحب نے سوچا کہ یہ بہترین موقع ہے کیوں نہ اس کرپشن سے پردہ اٹھایا جائے۔ چنانچہ اس فائل پر کاروائی کا حکم دے دیا۔ جب خبر میڈیا تک پہنچی تو سردار صاحب کو تشویش ہوئی۔موصوف نے فوری طور پر اپنی جماعت کے کارکن کو متحرک کیا اور اسمبلی ممبران کو بھی وارننگ دے دی کہ اگر معاملہ آگے بڑھا تو آپ بھی لپیٹ میں آئیں گے اس لیے میدان میں آجائیں۔ جب بات حد سے زیادہ بڑھ گئی تو بیرسٹر سلطان محمود صاحب کے ساتھ دینے والے سیاسی رہنما بھی پیچھے ہٹ گئے۔اور بیرسٹر صاحب کو مرکز کی طرف سے مشورہ دیا گیا کہ معاملہ حل کریں۔ سلطان محمود کا خاندان خود بھی کرپشن کا مرکز رہا ہے۔اور وہ تو سب کے سامنے تھا۔اس صورت حال کو سنبھالنے کے لئے دونوں جماعتوں کے اہم رہنماوں نے فیصلہ کیا کہ مذاکرات نیویارک میں کئے جائیں۔ مالِ مفت، دلِ بے رحم ۔نتیجہ یہ نکلا کہ سردار صاحب کا وفد سرکاری اخراجات پر نیویارک کے اہم اور مہنگے ہوٹل میں ٹھہرا۔ جہاں عرب کے بڑے بڑے شیخ ٹھہرتے ہیں پھر بیرسٹر سلطان محمود اپنے وفد کے ہمراہ پہنچے۔ جیسے پاک بھارت مذاکرات ہورہے ہوں۔ میرے ایک قریبی دوست مذاکرات کی رپورٹ فراہم کرتے رہے۔ تین دن کے لگاتار مذاکرات کے بعد سردار صاحب نے فیصلہ کیا کہ کینیڈا سے ان کے کو بیرسٹر صاحب کے ساتھ بھیجا جائے جو یہاں ریفیوجی سٹیٹس حاصل کر چکے تھے یہ صاحب بیرسٹر سلطان محمود کے مشیر کی حقیقت سے کام کریں گے اور آئندہ کسی پیچیدہ صورت حال کے بارے میں یہ مشیر سردار قیوم صاحب کو رپورٹ دیں گے اور آئیندہ کسی قسم کی ایسی بحرانی صورت حال سامنے نہیں آئے گی۔ چناچہ یوں دونوں کرپٹ لیڈران نے اپنے اثاثہ جات کو محفوظ رکھنے کیلئے سرکاری فنڈز پر ایک کروڑ روپے سے زیادہ کا ٹور پر خرچ کیا اور دونوں کے درمیان طے پایا کہ مال معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کریں گے۔یعنی بانٹ کر کھائیں گے تاکہ بات عوام تک نہ پہنچے۔ ہمارے ایک دوست جب صورت حال کی تفصیلات سنا رہے تھے تو روئے جا رہے تھے۔کہنے لگے راجہ صاحب۔ کشمیر میں لوگ مر رہے ہیں اور ہمارے یہ لیڈر سرکاری خزانہ سے اور

زکوٰۃ فنڈز سے رقوم لے کر یہاں قیام کے لیے آتے ہیں۔تین دن میں اس مہنگے ہوٹل کا بل اطلاعات کے مطابق ۲۰ ہزار یو۔ایس۔ ڈالر کا تھا۔جس میں سینکڑوں کارکن بھی اس معاہدہ کے دوران پارٹی میں شریک کئے گئے یہ صرف ایک لیڈر کا بل تھا۔دوسرے جو پارٹی کے باہر اور بوتل کے دلدادہ تھے۔ان کے بل کی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔ جب حکومتیں دونوں طرف کرپٹ ہوں تو انصاف کون کرے گا۔دوسری طرف مقبوضہ کشمیر سے پروفیسر بھیم سنگھ میر، واعظ عمر فاورق صاحب، فاروق عبداللہ اور عمر عبداللہ کا تعلق تو کشمیر سے صرف اس حد تک ہے کہ وہ اس بحران سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنا سرمایہ اکٹھا کرتے ہیں۔ مفتی سعید اور محبوبہ مفتی بھی اسی فہرست میں شمار ہیں۔ان افراد کو بھارتی حکومت باہر جانے کی اجازت دیتی ہے تو یہ لوگ اپنا توازن برقرار رکھنے کیلئے اکثر بھارتی حکومت پر بھی الزامات لگاتے ہیں۔مگر ساتھ ہی مجاہدین کے بارے میں بھی اُلٹے سیدھے سوالات کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے وہ لیڈران جو بھارتی زیادتیوں پر کوئی نرم پالیی اپنانے کو تیار نہیں تو وہ یا تو جیل میں ہوتے ہیں یا نظر بند یا ان کو محدود علاقے میں ردک لیا جاتا ہے۔ سیّد علی شاہ گیلانی، سیّد شبیر شاہ، اور لبریشن فرنٹ مقبوضہ کشمیر کی لیڈر شپ نے کسی بھی قسم کی سودہ بازی تسلیم نہیں کی۔ جس کے نتیجے میں ان کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ لبریشن فرنٹ کے یٰسین ملک ان ہی لیڈران میں سے ایک ہیں جن کو ایک عرصے سے جیلوں میں بدترین تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ان کی اہلیہ اور بیٹی پاکستان میں ہیں اور آج کل وہ تہاڑ جیل میں ہیں۔شدید بیماری کے باوجود ان کو کسی قسم کی سہولت حاصل نہیں رہی۔اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آیا ۔کشمیر کے ایک نامور صحافی نارتھ امریکہ کے دورے پر آئے تھے اور کینیڈا کے ایک شہر میں انڈین لابی کی سرپرستی میں چلنے والے ایک ساؤتھ ایشین ادارے نے ان کو دعوت دی۔ یہ ادارہ اس سے قبل پاکستان کی ایک نامور وکیل عاصمہ جہانگیر ایڈووکیٹ کو دعوت دے چکا تھا اور اس کے ساتھ ہی ایک نامور پاکستانی سکالر جو پاکستان کی قائداعظم یونیورسٹی میں ہی پروفیسر تھے اور پاکستان کے ایٹم بم کو نشانہ بناتے تھے اور سرحد کے چند ڈصحافیوں کو دعوت دے چکے تھے۔انہوں نے ایک صحافی کو دعوت دی۔اس تنظیم سے منسلک ایک پاکستانی جو کچھ حد تک کشمیر میں ہونے والی زیادتیوں پر تشویش کا اظہار کر چکے تھے۔ مجھے دعوت دی اور کہا کہ آپ کو سرپرائز دینی ہے جب میں نے وجہ پوچھی تو مجھے بتایا گیا کہ ایک صحافی مقبوضہ کشمیر سے آئے ہیں موصوف نے مجاہدین کی زیادتیوں کا ذکر کیا اور بھارت پر بھی تنقید کی۔ مگر زیادہ نشانہ مجاہدین تھے۔ جب تقریر کر چکے تو میرے سوالات پر ذرا چونکے۔ وہ میرا نام جانتے تھے کیونکہ وہ ہفت روزہ پڑھتے تھے اور میں اس میں لکھا کرتا تھا۔ خیر، میں نے انکو بتایا کہ جناب اگر آپنے آنا ہی تھا تو حق بات کرتے۔ بیکار نہیں دورہ کیا۔ بہر حال میں نے ان سے چند باتیں کیں۔ ڈاکٹر مطلوب حسین صاحب مرحوم مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے۔ دوسرے دن انہوں نے یہاں کے ایک ریسٹورنٹ میں ان کو دعوت دی۔ان کے ہمراہ چند دیگر افراد بھی تھے۔ باتوں باتوں میں راقم نے ان سے ذکر کیا کہ حضرت اگر آپ عمل نہیں کر سکتے تو پھر اس قسم کے دورے کرنے کا کیا فائدہ ہے۔ کہنے لگے جناب کشمیر سے باہر نکلنا تھا۔ چانس مل گیا تو سوچا کیوں نہ ایک چکر لگا لوں۔ مگر راجہ صاحب۔ اگر میں یہاں زیادہ لیکچر دونگا تو سرینگر ایئرپورٹ سے گھر پہنچنے تک اُڑا دیا جاؤں گا۔ پھر میں نے زیادہ بات نہ کی۔ ایک اچھے صحافی تھے اس لئے ہم نے زیادہ بات نہ کی ان کی بھی مجبوری تھی۔ہم نے ان کی تصویر لی۔ میں نے ایک مضمون ان پر ''کشیر' میں لکھا تھا۔ اچھے انسان تھے مگر اس بات کا افسوس ضرور رہا کہ ایسے کشمیری افراد کی تقاریر اور

دوروں سے کشمیری عوام کی آواز تقسیم ہوکررہ گئی۔اور بیرون دُنیا میں ہندوستان کومزید پروپیگنڈہ کا موقع مل گیا۔اورآج جس صورتِ حال سے کشمیر دوچار ہے۔اس کے ذمہ دار آزاد کشمیراور مقبوضہ کشمیر دونوں اطراف کے سیاستدان ہیں جودونوں اطراف سے اپنے خاندانوں کے لیے وظیفہ وصول کرتے رہےاور کشمیریوں کوخون میں نہلاتے رہے یہ لوگ دراصل کشمیریوں کے سب سے بڑے قاتل ہیں۔اس سلسلے میں سب سے اہم شخصیت کا دورہ مجھے آج بھی یاد ہے۔یہ 1990 کے دوران کی بات ہے کہ پاکستان کے سابق وزیراعظم اورسندھ کےاہم لیڈرایک سرکاری وفد کی قیادت کرتے ہوئے امریکہ اورکینیڈا کے دورے پرآئے۔وفدمیں چندنامی گرامی کشمیری شخصیات بھی شریک تھیں مگرکینیڈا کے دورے کے دوران زیادہ تر پاکستان کے ممبر پارلیمنٹ اورسابق سیکرٹری، وزارت خارجہ اور چند دوسرے افراد شامل تھے۔ ہمیں خصوصی طور پردعوت دی گئی کہ وہ مسئلہ کشمیرکوآگے بڑھانے کے لیے عالمی دورے پر ہیں اس لیے ہمیں کہا گیا کہ مانٹریال میں آپ اجتماع میں ضرور شرکت کریں۔اس قسم کے دوروں کا اہتمام سفارتخانہ کے ذریعے کیا جاتا ہےاور پاکستان کی تنظیمیں اکثر فنڈ حاصل کرتی ہیں۔ہوٹل میں ہال بک کروایا جاتا ہے اوراخبارات والے سرخیاں لگانے کے لئے بلائے جاتے ہیں تاکہ سفارتخانہ والوں کی بھی نوکریاں برقرار رہیں۔ڈاؤن ٹاون ہوٹل میں غلام مصطفیٰ جتوئی صاحب کی تقریر تھی۔ہم چند ساتھیوں کے ساتھ پہنچے جب تقریر ختم ہوئی تو میں نے جتوئی صاحب سے سوال کیا کہ جناب آپ کشمیر کے سلسلے میں دورے پر آئے ہیں ہم آپ کا شکریہ ادا کرتے ہیں مگرآپ کی تقاریر کا کشمیریوں کو کیا فائدہ ہوگا۔اجلاس میں انسانی حقوق کے ترجمان کودیکھا ہے۔کسی فارن میڈیا کو دیکھا ہے۔کشمیریوں کواس قسم کی مدد کی ضرورت نہیں۔موصوف بولے۔تو آپ بتائیں کشمیریوں کوکس قسم کی مدد کی ضرورت ہے میں نے انہیں کہا کہ حضرت آپ پاکستان سے آرہے ہیں آپ خود جانتے ہیں کہ کشمیریوں کی کس قسم کی مدد کی ضرورت ہے۔اس بات پر وہ خاموش ہوگئے۔شائید وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ سوال کرنے والا اتنا احمق نہیں ہے۔چنانچہ جب لوگ ادھرادھر ہونے لگےتو ہم نے ان سے درخواست کی کہ کشمیری کمیونٹی ایک دفتر کا افتتاح کرنے کی خواہش مند ہےاور یہ آپ کے ہاتھوں سے کروانا چاہتے ہیں۔موصوف نے شکریہ کے ساتھ یہ دعوت قبول کرلی۔دوسرے دن وہ وقت پر چند ساتھیوں کے ہمراہ پہنچ گئے۔افتتاحی پروگرام کرنے کے بعد میں نے تھوڑی دیران سے بات چیت کی اوران سے مزید بات چیت کے لیے وقت مانگا۔شام کو میں ان کے ہوٹل میں اپنے ایک دوست کے ہمراہ موجود تھا۔موصوف کا اے کلاس کمرہ دیکھ کر مجھے احساس ہوا کہ سرکاری اخراجات کرنے کا کیا طریقہ کار ہوتا ہے۔پورا گویا گھر تھا یہاں کے ہوٹل میں ٹاپ سویٹ میں پورا کچن، بیڈروم، بیٹھنے کا کمرہ اوردوسری سہولتیں بھی میسر ہوتی ہیں۔موصوف نے کہا کہ آپ یہاں فوٹو نہیں لے سکتے۔میں نے موصوف سے کہا کہ جناب ہمیں تصویر لینے کی ضرورت نہیں۔میں صرف آپ سے انٹرویو لینے آیا ہوں۔میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں ہونے والے دورے کے عالمی سطح پرکیا اثرات مرتب ہورہے ہیں اورآپ نے اس سلسلے میں کتنی پیش رفت کی ہے۔خیر باتوں کا سلسلہ ایک گھنٹے سے زیادہ عرصہ چلتا رہا ہے۔غالباً پاکستانی سفیر نے موصوف کو میرے بارے میں ساری صورت حال بتا دی تھی۔میں اس وقت اخبار''اپنا وطن'' کا ایڈیٹر تھا جس کے چیف ایڈیٹر جناب ارشد رندھاوا صاحب تھے جو غالبًا اور پاکستانی کمیونٹی میں پہلے پاکستانی تھے جنہوں نے اخبار نکالا اوراس میں کشمیراور پاکستان کی خبریں شائع کیں اوررائٹر کے مضامین شائع کرتے رہے۔یہ اخبار اردو اورانگریزی

کے علاوہ فرانسیسی زبان میں بھی مضمون شائع کرتا تھا۔جس کی وجہ سے یہ اخبار اس دور میں خاصا مشہور تھا چنانچہ جتوئی صاحب نے کھل کراظہار خیال کیا۔ان کا کہنا تھا کہ پاکستان میں عالمی پالیسی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔مرکزی لیڈرشپ انتہائی کمزور ہےاورقومی پالیسیاں چندافراد کے ہاتھ میں ہیں۔اس لیے راجہ صاحب، کشمیر صرف دوروں تک محدود ہے۔پھر موصوف نے آزاد کشمیر کے لیڈران سے لے کر پاکستان کے لیڈران کی تمام باتیں سامنے رکھ دیں۔کہنے لگے۔ہمیں صرف دوروں پراس لیے بھیجا جاتا ہے تاکہ ہمیں خوش کیا جاسکے۔یہ جوممبران اسمبلی آئے ہیں، ان کوخوش کرنے کے لیے کیا جارہا ہے۔ان کو کروڑوں روپے ان دوروں پر دیے جاتے ہیں۔یہ عیاشیاں کرتے ہیں، کلبوں میں جاتے ہیں۔آپ کے ایک نوجوان لیڈرجوکشمیر کے ہیرو بنے بیٹھے ہیں ان کا ریکارڈ دیکھ لیں۔یہ ایک مذاق بن کررہ گیا ہے بھائی ہم لوگ سندھی ہیں اور ہمارے وفاقی مفادات ہوتے ہیں قومی معاملات میں ہمیں صرف مرکزی پالیسی کوہی اپنانا ہوتا ہےاورخارجہ پالیسی سیاست دانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے۔موصوف کے مطابق ان کے سارے دورے کے دوران سفارتخانہ والوں نے کسی مقامی حکومت کے وزیر یا سیاستدان سے رابطہ نہیں کروایا۔اب ہم ان کی پالیسی کے مطابق عمل کرتے ہیں ہماری سیر کی سیر ہوجاتی ہے۔میڈیا ہماری خبریں لگا دیتا ہے۔اخبارات اورمیڈیا کی وجہ سے ہماری سیاست چلتی رہتی ہے۔واپس جاتے ہیں تو لوگ استقبال کرتے ہیں اورشکریہ ادا کرتے ہیں کہ ہم کشمیر کے بارے میں بات کرتے ہیں۔ہمارا ووٹ بینک بڑھتا ہے آپ کومعلوم ہے پاکستان کا ہرشہری کشمیری عوام سے ہمدردی رکھتا ہے 1947 میں ہماری غلط پالیسیوں کی وجہ سے ہم کشمیر کے بارے میں واضح فیصلہ نہ کرسکے۔بدقسمتی یہ تھی کہ قائدِ اعظم محمد علی جناح مرحوم کی صحت اچھی نہیں تھی۔مہاجرین کا دباؤ اس کے علاوہ تھا۔انتظامی اخراجات حد سے زیادہ تھے۔وہ اپنی خرابیِ صحت کے باوجود آبادکاری کے معاملات کی نگرانی کرتے رہے مگرکشمیر کے بحران پر چند لوگوں نے غلط راستہ اختیار کیا۔کشمیری قیادت تقسیم کا شکار ہوگئی۔شیخ عبداللہ نے غداری کی اور پنڈت نہرو اپنے وطن کوالگ ہونے دینے کے لیے تیار نہیں تھا۔میں نے آپ کے آزاد کشمیر کے بیشتر لیڈران سے بات چیت کی میں مرکزی سیاست میں متحرک رہا ہوں دراصل جب آزاد کشمیر کے لیڈر خود ہی رشوت خوری اورکرپشن کریں گےاورمسئلہ کشمیر کے ساتھ غداری کریں گےتو کوئی آپ کی مدد کیوں کرے گا۔میں نے ملٹری آف کشمیر آفیسرز کا جائزہ لیا ہے۔آپ کا آدھے سے زیادہ بجٹ ۹۲ آپ کے وزیراعظم ،وزیروں اورممبران اسمبلی کے گھروں میں جاتا ہےمگر پاکستان کے حکمرانوں کوحصہ مل جاتا ہے۔اس لیے سب خاموش ہیں مجھے علم ہے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ہورہی ہیں مگرکشمیر کے دونوں طرف کے لیڈران انڈیا اور پاکستان سے مفادات کے لیے سیاست کررہے ہوں تو غریب عوام کی کون سنے گا۔وہ مرتے رہیں گے۔مجھے اس بات کا احساس ہے مگر پالیسیاں ہم نہیں بناتے۔جناب ہمیں یہاں دوتین دن کے لئے دعوت دی گئی ہے۔جمعہ کے دن مانٹریال میں پروگرام تھا۔ہفتہ اتوار چھٹی ہے یہاں پر ہم سے کسی اہم شخصیت سے ملاقات کے انتظامات نہیں کیے گئے۔اب ہم یہاں آئے ہیں تو سیاحت کرکے واپس چلے جائیں گے۔میں یہاں پہلے بھی آتا رہا ہوں۔خوبصورت شہر ہے۔جب سیروسیاحت سرکاری خرچ پررواج بن گیا ہوتو ہم کیا کرسکتے ہیں۔موصوف سے اوربھی بہت سے مسائل پر بات چیت ہوئی۔موصوف نے یہ تسلیم کیا کہ کشمیر کا تصفیہ ہونا لازمی ہے۔اس سے پاکستان کے مفادات وابستہ ہیں۔سندھ طاس کا معاہدہ ہے پانی سارا کشمیر سے ہماری طرف آتا ہے۔کسی بھی قسم کا بحران ہماری معیشت کوتباہ کر

سکتا ہے۔اس کا احساس فوجی اور سیاسی اداروں کو بھی ہے مگر واضح پالیسی کے نہ ہونے کی وجہ سے ہم بحران سے دوچار ہیں اور یہ بحران کسی بھی وقت جنگ کی صورت اختیار کرسکتا ہے۔موصوف کا کہنا تھا کہ جلد بدیر یہ صورت حال برصغیر کی تباہی کا باعث بن سکتی ہے۔مگر عالمی حالات ایسے ہیں کہ اسلحہ کی ضرورت عالمی سطح پر ان ملکوں کو کنٹرول کرتی ہے اور یہ صنعتیں اپنا اسلحہ فروخت کرتی ہیں۔اور اکثر دنیا میں جنگوں کا نیا سامان تیار کرتی ہیں۔تاکہ انکا کاروبار محفوظ رہے۔اور انکا معیارِ زندگی برقرار رہے۔انکے ساتھ کھانا کھانے کے بعد ہم رخصت ہوئے۔شام کو مسلم کمیونٹی آف کیوبیک میں ہم نے کشمیر پر پروگرام ترتیب دیا۔جسمیں مختلف ملکوں کے نمائندوں کو بھی دعوت دی گئی۔جناب غلام مصطفٰے جتوئی صاحب کو بھی دعوت دی گئی مگر موصوف تشریف نہ لائے اور کہا کہ میرے وفد کے جملہ اراکین آجائیں گے۔

شام کو قونصل جنرل آف پاکستان، سابق خارجہ سیکریٹری نیاز احمد نائیک اور دیگر پیپلز پارٹی کے ممبران پارلیمنٹ تشریف لائے۔راقم کے خطاب کے بعد چند ممبران نے خطاب کیا۔مگر وفد کے اراکین کی مایوسی سے ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے غلام مصطفٰے جتوئی صاحب کی غیر حاضری کو اچھا نہیں سمجھا اور ایک رکن پارلیمنٹ نے جانے سے قبل ازراہِ مذاق کہہ دیا۔راجہ صاحب بُرا نہیں منانا۔پاکستان کے عوام کشمیر کے عوام کے ساتھ ہیں مگر ہمارے جاگیردار صرف پیٹ پوجا کرتے ہیں۔ان جاگیرداروں کو صرف اپنی ذاتی عیّاشیوں کیلئے دولت کی ضرورت ہوتی ہے۔وہ اپنا پیسہ خرچ نہیں کرتے۔شائید قبر میں لیجائیں گے۔انکا اشارہ جتوئی صاحب کی طرف تھا۔جو کشمیر کے نام پر فنڈز حاصل کرنے دورے پر تھے۔انکا کہنا تھا کہ فی ممبر کو سفری سہولیات کے حوالے ذاتی اخراجات کیلئے خاصی رقم ملیں۔اور اسکے ساتھ ہی ہر جگہ سفارتخانہ نے انکے ذاتی اخراجات اور رہائش کے انتظامات کئے۔گویا وہ اپنی رقوم صحیح سلامت لیجا رہے ہیں۔میں نے انکا شکریہ ادا کیا۔دوسرے دن انکی روانگی پر سفارتکار حضرات کی کاریں انکو ائیرپورٹ پر لے گئیں۔ہمیں مطلع کیا گیا کہ آپ ایئرپورٹ آنا چاہیں تو روانگی کا وقت بتایا گیا مگر ہم میں سے کوئی نہیں گیا۔ہمیں علم ہوگیا تھا کہ انکے دورے بھی ہمارے کشمیری لیڈران کی طرح فنڈز کو قانونی بنانے کیلئے ہوتے ہیں۔اس سلسلے میں ہمارے ایک لیڈر کے بارے میں یہ بات اس دور میں اکثر بیان کی جاتی تھی کہ موصوف نے پبلک فنڈز سے ۶۰ لاکھ روپے کی رقم نکلوائی کہ وہ لندن میں کشمیر کانفرنس پر خرچ کریں گے۔رقم کے بارے میں ایک بیوروکریٹ نے بھی تسلیم کیا کہ ہمیں اس فنڈ کا علم ہے۔جب موصوف لندن پہنچے تو جس ہال میں کانفرنس کا اہتمام کیا جارہا تھا۔وہاں پر اطلاع ملی کہ اس جگہ بم رکھا گیا ہے۔پولیس نے فوراً کاروائی کرتے ہوئے عمارت بند کردی اور تحقیقات شروع کردی گئی۔چنانچہ کانفرنس ملتوی کردی گئی۔اخبارات میں سرخیاں لگیں۔انکا کام ہوگیا۔۶۰ لاکھ روپے ہضم کرلئے گئے۔اور اوپر سے مقامی افراد سے چندہ بھی وصول کیا گیا۔اطلاعات کے مطابق ان رقوم سے لندن میں جائیدادیں خریدی گئیں۔اور وکلاء سے ملکر کمپنیاں بنائی گئیں اور بعض ازاں یہ جائیدادیں فروخت کرکے دوگنا منافع کمایا گیا۔اس قسم کے کاروبار نیویارک میں بھی کئے گئے۔اور پاکستان میں بھی یہ لیڈر اربوں کے کاروبار کررہے ہیں اور یہ سب کچھ کشمیر کے نام پر تجارت کے ذریعے کیا جارہا ہے۔اور اسمیں انکی معاونت کرنے والے وزارت امور کشمیر مافیا کے ذریعے کام چلاتے ہیں اور پاکستان کی قومی دولت بھی دونوں ہاتھوں سے لُوٹ رہے ہیں۔اور آزاد کشمیر کے حصے کی آمدنی پر بھی اپنا ہاتھ صاف کررہے ہیں۔پھر اوورسیز تارکینِ وطن کی سیٹ کے نام پر لندن سے کروڑوں روپوں کی رقوم حاصل کی گئیں۔جسمیں جماعتی

فنڈز بھی شامل تھے۔چند سال قبل آزاد کشمیر کے پی۔ٹی۔آئی کے ایک لیڈر نے لندن میں ۲۷ ہزار پاؤنڈ کا چندہ جمع کیا اور یہ چندہ اپنے اکاؤنٹ میں ڈال دیا۔جب پی۔ٹی۔آئی کے لیڈر عمران خان کو علم ہوا تو چندہ واپس جماعت کے فنڈ میں جمع کروانے کا مطالبہ کردیا اور موصوف کو عہدہ سے علیحدہ کردیا۔مگر بعد ازاں اس شخص نے معذرت کرکے چندہ کی رقم پی،ٹی۔آئی کے اکاؤنٹ میں جمع کروادی اور یوں انکو دوبارہ عہدہ دے دیا گیا۔اس سے صورت حال کا علم ہوجاتا ہے۔یہ کشمیر کا کاروبار دیارِ غیر میں اس تیزی سے چلا ہے کہ ان کشمیری لیڈران کی وجہ سے لندن، نیویارک اور کینیڈا کے بہت سے گھرانے دیوالیہ پن تک جا پہنچے۔گھرانوں میں جھگڑے شروع ہوئے۔میں لندن میں بعض ایسے خاندانوں کو جانتا ہوں جو ان لوگوں کی سیاست کا شکار ہوکر تباہ ہوئے۔اپنی رہائشگاہوں کو داؤ پر لگا دیا۔بچے بحران سے دوچار ہوئے۔اور سیاسی لیڈران نے جب دیکھا کہ یہ صاحب کام کے نہیں رہے تو انہوں نے نئے گاہک تلاش کرلئے۔اور یوں یہ کاروبار ابھی تک اسی طرح چل رہا ہے۔جبکہ کشمیر میں ہونیوالے خون خرابہ پر ان لیڈران نے ذرا بھر بھی پاکستان میں آواز بلند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔وہ لوگ جو نیلا بٹ میں جنگ آزادی کے نعرے لگا کر یومِ نیلا بٹ پر ہر سال کروڑوں روپے اس جعلی نعرہ بازی پر پبلک فنڈز سے ضائع کرتے تھے۔انکی آوازیں عین وقت پر بند ہوگئیں۔جبکہ کشمیر کی عوام کو انکی ضرورت تھی۔یہ وہ لوگ ہیں جو کشمیری خون کے سوداگر اور کشمیری عوام کے غدّار ہیں۔مگر ابھی تک سادہ لوگ انکو ہیرو بنا کر پوجا پاٹ کررہے ہیں۔

سّید نذیر گیلانی۔ ہیومین رائیٹس لیڈر آف یو۔کے اور اقوام متحدہ میں کشمیر پر ایک اتھارٹی

سّید نذیر گیلانی ان عظیم شخصیات میں سے ایک ہیں جنہوں نے مسئلہ کشمیر میں عالمی قوانین کے تحت لگاتار آواز بلند کی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ اکثر ہمارے لوگ نظریاتی یا سیاسی اختلاف کیوجہ سے کسی بھی شخص کو تسلیم کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتے اور اکثر سیاسی لیڈران ان لوگوں کو بدنام کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔مگر ہر مشکل دور میں اخبارات کے ذریعے، تقاریر اور رابطوں کے ذریعے موصوف بین الاقوامی میدان میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔اور ہیومین رائٹس کے ہر پلیٹ فارم پر موصوف نے اپنی استعداد کے مطابق سب سے زیادہ حصّہ ڈالا ہے۔میں ۱۹۹۰ء کے دور میں جب لندن پہنچا تو سب سے پہلے میں نے دو اشخاص کو فون کیا۔ایک ڈاکٹر ایوب ٹھاکر اور دوسرے سیّد نذیر گیلانی صاحب تھے۔ان سے میرا غائبانہ تعارف تھا۔کیونکہ میں گذشتہ نصف صدی سے مسئلہ کشمیر کو اپنے دوستوں کے تعاون سے مختلف ملکوں میں اٹھاتا رہا ہوں۔مختلف سیمیناروں میں شرکت کی اور میں اکثر مختلف انسانی حقوق کی رپورٹوں پر مشتمل رپورٹ اپنی طرف سے تیار کرکے مختلف اداروں اور یوروپ اور نارتھ امریکہ میں اپنے دوستوں کو بھیجتا رہا ہوں اور سفارکاروں اور مختلف ملکوں کے سربراہان کو بھیجتا رہا ہوں وہاں انکی رپورٹ بھی ہر وقت میری معاون اپنی اور انکی طرف سے لکھی گئی انسانی حقوق کی رپورٹوں کو بطور ریفرنس بھیجتا رہا۔موصوف کو میں نے اس نازک وقت میں ہمیشہ کام کرتے ہوئے پایا۔انکی دعوت پر لندن پارلیمنٹ ہاؤس کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں دعوت میں شرکت بھی کی۔انکا رابطہ عالمی سطح پر انسانی حقوق کے اداروں کے ساتھ بھی رہا ہے۔اور آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کی قیادت سے بھی انکے روابط رہے ہیں۔اور موصوف اپنی طرف سے ایک مخصوص انٹرنیشنل فریم ورک پر کام کرتے نظر آئے۔اس سلسلے میں دوسری

دفعہ جب میں پاکستان گیا تو ان سے ملاقات اچانک ہوگئی۔میں صدر آزاد کشمیر سردار سکندر حیات صاحب سے ملنے کا پروگرام بنا رہا تھا کہ انکا فون آ گیا کہ بھائی آپکے پیشہ سے منسلک ہیومین رائٹس کے ایک اہم راہنما نذیر گیلانی صاحب بھی آئے ہوئے ہیں۔کیوں نہ آپ میرے دفتر آ جائیں۔آپ اور لوگوں سے بھی مل لیں گے۔وہاں عباس پور کے راہنماؤں کے علاوہ راجہ فاروق حیدر صاحب بھی تھے جو غالباً ابھی سیاست کے میدان میں پیشرفت کر رہے تھے۔اسکے علاوہ بہت سے صحافی حضرات بھی شامل تھے۔وہاں پر سیّد نذیر گیلانی صاحب نظر آئے تو خوشی ہوئی۔موصوف نے جس طریقے سے صدر آزاد کشمیر سے بات کی وہ انکا تجربہ اور عملی طور پر بہتر کارکردگی کی مثال تھی۔جہاں میں نے کشمیری لیڈران کے دوروں کو سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔وہاں سیّد نذیر گیلانی صاحب نے نہایت ہی تحمل مزاجی سے سردار صاحب کو بتایا کہ آپ حکومت پاکستان کو تجویز دیں کہ بعض اہم ملکوں میں سفارخانوں میں کشمیر مشن کی چیئر قائم کریں۔جہاں ان کا ایک نمائیندہ ہو جو سفارتی محاذ پر ۲۴ گھنٹے کام کرے۔اور مسئلہ کشمیر کی سنگین صورت حال کے بارے عالمی برادری کو آگاہ کیا جائے۔یہی وہ واحد طریقہ رہ گیا ہے۔ہم جانتے ہیں کہ آپ سب کوششیں کر رہے ہیں۔مگر اسکے اثرات سامنے نہیں آ رہے۔وہ مختلف معاملات پر ممبران اسمبلی سے بھی خاص بات چیت ہوئی۔جب ہم باہر آئے تو مجھے یاد ہے گیلانی صاحب نے مجھ سے ہاتھ ملایا اور بعض معاملات پر میرا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا۔راجہ صاحب۔دوسرے راجاؤں کی طرح چھرا لیکر اندر جانے کی ضرورت نہیں۔ان لوگوں کے ساتھ تحمل اور بردباری کے علاوہ بات کرنے کا فائیدہ نہیں ہے۔نقصان ہمارا ہی ہوگا۔بعد ازاں مجھے اس بات کا علم ہوا۔جب مختلف ملکوں میں میرے دوستوں کو الزامات کا سامنا کرنا پڑا اور ہمارے ایک اخباری نمائیندے کو مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔نارتھ امریکہ اور یوروپ میں ۱۹۹۰ء سے لیکر کافی عرصہ تک ڈاکٹر ایوب ٹھاکر، سیّد نذیر گیلانی، سیّد منور حسین مشہدی، ڈاکٹر غلام نبی فائی اور مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھنے والے افراد اور نیو یارک میں آزاد کشمیر کے ایک نامور راہنما راجہ حلیم خان اور پھر لبریشن فرنٹ کے راجہ مظفر صاحب نے کافی کام کیا۔برطانیہ میں جمّوں و کشمیر لبریشن فرنٹ کے لئے کافی کام کیا۔مگر بدقسمتی سے انکی جدوجہد کشمیری عوام میں تقسیم کے عمل سے دوچار ہوگئی۔اور ان نظریاتی کارکنوں کو بعض انتہا پسند پالیسیوں کی وجہ سے برطانیہ کی کشمیری برادری میں زیادہ مقام نہ مل سکا۔اسکا فائیدہ بھارت نے اٹھایا اور خودمختاری کے نام پر یوروپ اور نارتھ امریکہ میں بعض افراد کو اپنا کارکن بنا دیا۔جس کی وجہ سے اس تنظیم کے بارے میں عام کشمیری باشندے تذبذب کا شکار ہوئے۔مگر یہ اک حقیقت ہے کہ اس تنظیم نے مقبوضہ کشمیر اور دیارِ غیر میں کشمیری عوام کے حقوق کیلئے بڑی قربانیاں دیں۔انمیں امان اللہ خان مرحوم نے ایک اہم قائد کا کردار نبھایا اور کسی لیڈر کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے اپنے مشن پر کام جاری رکھا۔

یہ وہ لوگ تھے جن کو حکومت آزاد کشمیر کو خصوصی ایوارڈ سے نوازنا چاہیئے تھا۔جنھوں نے دن رات ایک کر کے مسئلہ کشمیر کو عالمی سطح پر زندہ رکھا۔جو کام پاکستان کے سفارتکار نہیں کر سکے وہ کام امریکہ، کینیڈا، برطانیہ اور یوروپ کے دوسرے شہروں میں چند افراد اپنے ذاتی خرچ پر کرتے رہے۔مگر کبھی کسی شہرت یا اخباری لیڈری کی ضرورت محسوس نہیں کی۔بلکہ یہ لوگ وطن کے جذبہ آزادی کا خواب دیکھتے ہوئے اپنے کام کرتے رہے۔میں نے بعد میں کئی کارکنوں کو ذاتی اخراجات پر آٹاوہ اور دوسری جگھوں پر مظاہروں میں شریک ہوتے دیکھا۔ایک عزیز جو انتہائی معزز شخصیت تھے۔بس کا واپسی کا کرایہ نہیں تھا۔میرے پاس

آئے تو کہنے لگے۔راجہ صاحب۔آپکی کار میں جگہ ہوگی۔پوچھا کیوں۔کہنے لگے۔تین دوستوں کو ساتھ لایا تھا۔انکا کرایہ تو واپسی کا ادا کر دیا تھا۔رقم کم ہوگئی۔میں واپس کیسے جاؤنگا۔میں نے اپنے ایک دوست کے ذریعے انکو روانہ کیا۔برطانیہ میں بھی میں نے ایسے بےلوث کارکن دیکھے۔جنکو یہ لیڈر زندگی بھر بیوقوف بناتے رہے۔

کشمیر 1990ء سے قید خانہ بنتا گیا

اس حقیقت سے انکار کرنا ممکن نہیں کہ حکومت کانگریس کی ہو یا مودی کی ہو۔حکومت ہند کی کارکردگی کشمیر کے بارے میں انتہائی ظالمانہ رہی ہے۔ہر حکومت ہندو انتہا پسندوں کو خوش کرنے کے لیے سخت ترین اقدامات کرتی رہی ہے۔جس کی وجہ سے یہ لیڈر اکثریت حاصل کرتے رہے۔اندرا گاندھی کی طرف سے بنگلہ دیش بنانے میں مدد دینے کا اقدام اس بات کا واضح ثبوت ہے۔کہ ہندوستان کی لیڈر شپ سستی شہرت حاصل کرنے کے لیے دو ذرائع اختیار کرتی ہے یا ہندوستان کے اندر مسلمانوں پر ظلم وستم روا رکھا جاتا ہے یا کشمیر میں ظلم وستم کا سلسلہ جاری رکھا جاتا ہے اور یوں ان کو ملک کے اندر شہرت بڑھانے میں مدد ملتی ہے. مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے کے بعد موصوف نے کھلے عام کہ ہم نے ایک ہزار سال کا بدلہ لے لیا یعنی پاکستان کو دو ٹکڑے کر دیا۔جب بنگلہ دیش بنا تو پاکستان کی انتہائی تذلیل کی گئی. قیدیوں کی رہائی کے لئے وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو مرحوم پہ پاک فوج کا دباؤ بڑھا اور فوجیوں کی رہائی کے لیے کوششیں شروع کی گئی۔آخرکار شملہ میں ذوالفقار علی بھٹو اور اندرا گاندھی کے درمیان 12 جولائی 1972ء کو ہیماچل پردیش کے صدر مقام شملہ میں معاہدہ طے پایا۔اس سے قبل بنگلہ دیش جیش لبریشن آرمی جو دراصل بھارت کی سرپرستی میں بنگلہ دیش میں آپریشن تھا۔1971ء میں بنگلہ دیش کی آزادی کی صورت میں سامنے آیا یہ معاہدہ ذوالفقار علی بھٹو اور اندرا گاندھی کے درمیان طے پایا۔اس میں حکومت پاکستان کو مجبور کیا گیا کہ بنگلہ دیش کو آزاد اور خودمختار ریاست تسلیم کرے۔چنانچہ اس معاہدے کے تحت ایل۔او۔سی (لائن آف کنٹرول) یا سیز فائر لائن آف کنٹرول کو انٹرنیشنل بارڈر قرار دیا گیا۔اس وقت بھارت کے بیوروکریٹ نے یہ تسلیم کیا تھا کہ پرائیویٹ بات چیت میں دونوں لیڈران نے سیز فائر لائن آف کنٹرول کو انٹرنیشنل بارڈر کی حیثیت سے قبول کرنے کا وعدہ کیا تھا۔مگر پاکستان نے ایسی کسی بات چیت سے مکمل طور پر انکار کر دیا۔چنانچہ اس معاہدے کے بعد دونوں کی طرف سے بین الاقوامی ملٹری آبزور گروپ آف انڈیا اینڈ پاکستان کو مکمل طور پر غیر اہم بنا دیا گیا۔یہ گروپ دونوں ملکوں کی طرف سے کشمیر سیز فائر لائن آف کنٹرول کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات کرتا تھا تاکہ دونوں طرف کی آبادیوں کو تحفظ فراہم کیا جا سکے جو کراچی معاہدہ 1949 کے تحت انجام پایا تھا۔مگر شملہ معاہدہ کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان سیز فائر لائن پر خلاف ورزیوں کا سلسلہ آج تک جاری ہے۔جہاں دونوں طرف عام شہری زخمی اور ہلاک ہو رہے ہیں۔مکانات، سکول اور ٹریفک کو دونوں طرف نشانہ بنایا جاتا ہے۔ظاہر ہے، جب فائرنگ ہوتی ہے تو اس کا نشانہ کوئی بھی ہو سکتا ہے۔یوں دونوں طرف رہنے والے کشمیریوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں اور شملہ معاہدہ کے بعد اقوام متحدہ کا ادارہ صحیح طریقہ سے ان خلاف ورزیوں کا نوٹس لینے کی پوزیشن میں نہیں رہا۔شملہ معاہدہ کے باوجود دونوں ملکوں کے درمیان بعض اوقات شدید تصادم کی صورتحال جاری رہی اور یہ معاہدہ بھی پاک بھارت تعلقات میں بہتری نہ لا سکا۔وجہ صاف ظاہر ہے

بھارت کا نشانہ آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان تھے۔ بھارت کی پیٹھ پر اسرائیل، برطانیہ اور امریکہ تھے اور وہ چین کی طرف سے پاکستان کو گرم پانیوں تک پہنچنے کے خلاف تھے۔ چنانچہ جہاں اسرائیل، انڈیا کے اندر دہشت گردی کی وارداتوں کی منصوبہ بندی کر کے انڈیا کی پوزیشن بہتر بنا کر پاکستان کے خلاف منصوبہ کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ وہاں برطانیہ اور امریکہ اس سلسلے میں بھارت کی فوجی اور مالی امداد کی تیاری کرتے رہے۔ چنانچہ 1984ء میں انڈیا نے اسرائیل اور مغربی طاقتوں کی سرپرستی میں آپریشن میگدوت (Meghdootoperation) کیا اور سیاچین گلیشیئر کا وہ علاقہ ہتھیا لیا جو دراصل مکمل طور پر غیر آباد تھا اور سخت سردی کی وجہ سے اس علاقے میں میں کسی قسم کی فوجی کارروائی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ بھارت کا مقصد آہستہ، آہستہ گلگت اور بلتستان کی طرف پیش قدمی کرنا تھا۔ سیاچین میں بھارتی پیش قدمی کرنے کی اطلاعات ملنے پر پاکستان نے سخت ترین سرد علاقے میں اپنی فوجیں اتار کر بھارت کو مزید آگے بڑھنے سے روک دیا اور آج تک دنیا کے سرد ترین علاقے میں جہاں ماحولیات کو تحفظ فراہم کرنا چاہئے۔ کیونکہ یہ گلیشیئر دونوں ملکوں کو صاف پانی فراہم کرتے ہیں۔ دونوں ملک اس پانی کے ذخیرے کو تباہ کرنے کے لیے آئے روز گولے برساتے ہیں۔ یہ بھی ایک عالمی سازش کا حصہ ہے۔ مگر بدقسمتی سے بھارت سرکار میں پاکستان کے خلاف نفرت اور اکھنڈ بھارت کے نعرے آج بھی پاکستان کو ختم کرنے کے لئے ان کی کوششوں کا حصہ ہیں اور ان کوششوں میں دنیا کے بعض اہم ملک بھارت کی مدد کر رہے ہیں۔ سیاچین کا تصادم اس قدر شدید تھا کہ جب بحران حد سے زیادہ آگے بڑھنے لگا اور بھارت کی کامیابی نظر نہ آئی تو امریکہ نے بھارت کو مذاکرات کے لئے کہا اور یوں یہ بحران بڑی جنگ سے بچ گیا۔ پھر 1999ء میں کارگل جنگ شروع ہوئی۔ اس سلسلے میں فوجی ماہرین کے مطابق بھارت نے بعض اہم چوٹیوں پر اچانک حملہ کر دیا تھا۔ اور قبضہ کرنے کے لئے باقاعدہ فضائیہ کی مدد حاصل کی تھی۔ مگر بروقت کاروائی سے نہ صرف بھارت کو روک دیا گیا بلکہ بھارت کو مجبوراً جانی نقصانات کی وجہ سے یہ جنگ روکنی پڑی۔ اس سلسلے میں وزیراعظم میاں نواز شریف کو امریکہ آنے کی دعوت دی گئی اور اور اس مسئلہ کو حل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ سیاچین گلیشیئر میں تصادم کی وجہ سے دونوں طرف کی آبادیوں کو شدید ترین موسمی حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ برفانی تودوں کے گرنے اور لینڈ سلائیڈز کی وجہ سے نارتھ کشمیر کو شدید نقصان کا سامنا کرنا پڑا اور گلیشیئر آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ شملہ معاہدے میں اس بات کا واضح ذکر موجود ہے کہ جموں و کشمیر کے فائنل حل کیلئے نئے اقدامات کئے جائیں۔ مگر اس معاہدے کے بعد دونوں ملکوں نے مسئلہ کشمیر کے بارے میں خاموش پالیسی اختیار کیئے رکھی اور قتل عام کا سلسلہ جاری رہا۔ جہاں ایک طرف مقبوضہ کشمیر میں زیادتیوں کا سلسلہ جاری رہا تو دوسری طرف سیز فائر لائن پر بھارتی حکومت کی کارروائیوں سے تصادم کی صورتحال آج تک اسی طرح جاری ہے۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد سکھ حکومت نے آزادی حاصل کرنے کا مطالبہ کیا۔ سکھ جرنیل کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد پاکستان کے بعض لیڈران نے بھی اس قوم کی خودمختاری کی حمائت کی اور دیارِ غیر میں سکھوں نے زبردست جدوجہد کی۔ چندے جمع کیے۔ مجھے یاد ہے مسئلہ کشمیر پر ہمارے ایک سیمینار میں 1983ء میں سکھ لیڈران نے کھل کر اظہارِ خیال کیا اور ایک مظاہرے میں بھی سکھ لیڈران نے شرکت کی۔ اس سے کشمیری اور سکھ لیڈران کے درمیان تعاون بڑھا۔ جرنیل سنگھ بھنڈرانوالہ ایک ایسا عظیم لیڈر سامنے آیا۔ جس نے گولڈن ٹیمپل کا انتظام سنبھالا اور پوری دنیا کے سکھ عوام کی آواز بن گیا۔ چنانچہ 12 جولائی 1982ء کو اسی ہرچند سکھ

لنگوال پریزیڈنٹ آف سکھ پولیٹیکل پارٹی نے بھنڈرانوالہ کو گرفتار ہونے سے بچانے کے لیے گولڈن ٹیمپل کمپلیکس میں رہائش اختیار کرنے کے لیے کہا۔ مگر حکومت ہند نے الزام لگایا کہ خالصتان کے لوگوں نے کمپلیکس کو اسلحہ گودام کی صورت میں آئندہ مسلح جدوجہد کے لیے بنیاد بنا کر آگے بڑھنے کا ارادہ کیا ہے۔ اور جموں کے ایک گردوارہ میں پاکستان سکھ دہشت گردوں کو ٹریننگ دے رہا ہے۔ چنانچہ سوویت یونین کے کے۔ جی۔ بی نے اطلاع دی کہ سی۔ آئی۔ اے اور آئی۔ ایس۔ آئی دونوں مل کر پنجاب کو خودمختار ریاست بنانے کی طرف پیش رفت کرنے والے ہیں۔ اور جلد ہی پاکستانی کمانڈوز اس میں حصہ ڈالنے کی تیاری کر رہے ہیں۔ چنانچہ اندرا گاندھی اب ہندو انتہا پسندوں کی ہیروئن بن چلی تھیں اور موصوفہ نے اب نہتے سکھوں کو قتل کرنے کا پروگرام بنایا تھا۔ تاکہ آئندہ اپنے خاندان کے لیے راہ ہموار کر سکیں۔ چنانچہ 3 جولائی 1984ء کو انڈین آرمی نے سارے گردوارہ اور ٹیمپل کا محاصرہ کر لیا اور سویلین لوگوں کو باہر آنے کا حکم دیا۔ مگر زائرین نے باہر آنے سے انکار کر دیا۔ اور بھنڈرانوالہ کا تحفظ کرنے اور جان قربان کرنے کا اعلان کر دیا۔ دو روز فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا۔ گو وہاں پر کوئی خاص اہم ہتھیار نہیں تھے مگر مسلح سکھ گارڈ جو بھنڈرانوالہ کے ساتھی تھے۔ انہوں نے فوری طور پر جوابی کارروائی شروع کر دی۔ جس سے سو کے لگ بھگ بھارتی فوجی ہلاک ہوئے اور سو سے بھی زیادہ زخمی ہوئے۔ بعدازاں سکھ پیروکار جو فائرنگ کے دوران گھیرا توڑ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ یہ تفصیلات انڈین سکھوں کو بتائی کہ انڈین آرمی میں موجودہ انتہا پسند ہندوؤں آر۔ ایس۔ ایس کے کارکنوں کو سب سے پہلے آگے کیا گیا۔ اور ہزاروں سویلین زائرین کو قتل کرنے کے بعد ان کے زیورات سمیت ٹیمپل سے کئی ارب روپے کے نوادرات بھی لے گئے۔ جو آر۔ ایس۔ ایس کے فنڈ میں جمع کروائے گے۔ جب یہ ساری صورت حال پوری دنیا کے سامنے آئی۔ تو سکھ پوری دنیا میں مظاہرے کرنے لگے۔ بھارتی فوج نے سویلین کے مرنے کی تعداد بہت کم بتائی۔ جبکہ اطلاعات کے مطابق کم ازکم دس ہزار افراد قتل کیے گئے۔ جن میں بچے، بوڑھے، جوان سب شامل تھے۔ رات کے وقت مردہ لاشوں کو ٹرکوں میں ڈال کر فوج کی نگرانی میں شہر سے باہر لے جا کر گڑھے کھود کر دبا دیا گیا۔ بعض کو کہیں سو میل دور لیجا کر جلایا گیا۔ تاکہ کسی کو علم نہ ہو سکے۔ بے شمار سکھ جو دیارِ غیر میں والدین کو تلاش کرنے کے لئے پنجاب فون کر رہے تھے۔ ان کو اپنے والدین اور رشتہ داروں کا کوئی علم نہیں تھا۔ ایک سردار بوٹا سنگھ جموال کا پورا خاندان گولڈن ٹیمپل میں تھا۔ اس کو ان کی لاشیں نہیں مل سکیں۔ جب وہ ایک سال کے بعد واپس گیا۔ تو اسے علم ہوا کہ بھارت نے کس طرح ان کی لاشوں کو ٹھکانے لگایا۔ مگر ایک ماہ کے بعد 31 اکتوبر کو اندرا گاندھی کے جنونی پن اور شہرت کی خاطر قتل عام کرنے پر اندرا گاندھی کو ایک سکھ باڈی گارڈ نے قتل کر دیا۔ اور یوں 31 اکتوبر 1984ء کو ایک اور قتل عام کی ابتدا ہوئی۔ دوسرے دن پورے دہلی اور اردگرد میں سکھ کاروباری ادارے اور گھروں کو نشانہ بنایا گیا۔ چنانچہ 1984ء سکھ قتلِ عام کے بارے میں جو رپورٹ انڈین ماہرین نے
پیش کی۔ اس کے مطابق کم ازکم ایک لاکھ سکھ قتل کیے گئے۔ اور یہ قتل عام پورے انڈیا میں کانگریس اور آر۔ ایس۔ ایس کے کارکنوں نے سرانجام دیا۔ ان کی جائیدادیں قبضہ میں لے لیں۔ جعلی خریداری کے کاغذات تیار کیے گئے اور چالیس ارب روپے سے زیادہ کی جائیدادیں جلائی گئیں۔ جن میں سکھ خاندانوں کو زندہ جلایا گیا۔ یہ انڈیا کا سب سے بڑا قتل عام تھا۔ اور اس کے بعد راجیو گاندھی بھی تامل ٹائیگرز کا نشانہ بنا۔ یہ تاریخ کا سیاہ ترین باب تھا۔ جس میں کئی سال تک بھارتی پنجاب میں سکھوں کا قتل

عام ہوتا رہا۔اس دوران سکھوں کی کشمیری عوام کے ساتھ ہمدردیاں بڑھیں۔اور سکھ اور کشمیری اکثر دیار غیر میں آج تک ایک دوسرے کا تعاون کررہے ہیں۔

یہ تو حقیقت ہے کہ کشمیر میں کرفیو اور ہڑتالوں کے ساتھ ساتھ گرفتاریوں کا سلسلہ تیزی سے جاری رہا۔ اور کانگریس سرکار کے دوران بھی کشمیر کی تقسیم کا سلسلہ جاری رہا۔اور اس دوران وادی کشمیر میں خصوصی طور پر زیادتی کا سلسلہ بھی جاری رہا۔مگر بھارتی جنتا پارٹی آر۔ایس۔ایس کی مدد سے ایک ایسے شخص کو آگے لانے کی کوششیں کی گئیں جو ہندوستان میں ان کے مقاصد کی تکمیل کر سکے اور وہ شخص نریندر مودی تھا۔ جس نے وزیر اعلیٰ بننے کے لیے کمزور ترین وزیر اعلیٰ کے کیشو بھائی پٹیل کی کمزور صحت اور گرتی ہوئی ساکھ سے فائدہ اٹھا کر گجرات کی اسمبلی الیکشن میں کامیابی حاصل کر لی۔2001ء میں موصوف کی جیت نے آر۔ایس۔ایس کو آگے بڑھنے کا موقع ملا۔اس سے قبل بمبے دہشتگردی (Bombay attack) جس کے تار اسرائیلی ادارے موساد اور سی۔آئی۔اے اور ''را'' سے ملتے تھے۔آر۔ایس۔ایس نے خوب پروپیگنڈا کیا۔اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اپنے ٹریسٹ سکواڈ کے چیف کو ایک گلی میں قتل کروادیا گیا۔جو ہندوانتہا پسند گروپ کیخلاف تحقیقات کر رہا تھا۔چنانچہ ایک منصوبے کے تحت سارا الزام پاکستان پر لگایا گیا۔اور پاکستان کو دہشت گردوں کی سرپرستی کا الزام دے دیا۔پاکستان کی طرف سے صحیح پالیسی سامنے نہ آنے کی وجہ سے پاکستان کو دنیا بھر میں بدنام کیا گیا۔پھر 2002ء کے گجرات قتلِ عام میں جس طرح نریندر مودی نے مسلمانوں کا قتل عام کیا۔اس سے یہ بات واضح ہوگئی کہ انتہا پسند گروپ پورے ہندوستان کو مسلمانوں سے صاف کرنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔چنانچہ اس پر عالمی ردعمل سامنے آیا۔اور نریندر مودی نے گجرات میں قتلِ عام پر عالمی ردعمل کے باوجود اپنا پروگرام جاری رکھا۔اسے پتہ نہیں تھا کہ اس کو بیرونی دنیا کی حمایت حاصل ہے۔اور یہ ظاہری طاقتیں محض زبانی جمع خرچ کر رہی ہیں۔اس سلسلے میں خلیج کی ریاستوں کے ساتھ سرمایہ کاری کی وجہ سے اسے ان ریاستوں کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

چنانچہ مودی نے اس موقع سے خوب فائدہ اٹھایا اور پاکستان کی غیر مؤثر خارجہ پالیسی کی وجہ سے وہ انڈیا میں حکومت بنانے میں کامیاب ہوگیا۔اور لوئر ہاؤس میں کامیابی کے بعد وزیر اعظم بن گیا۔وزیر اعظم بنتے ہی موصوف نے غیر ملکی سرمایہ کاری کے لیے اپنے دروازے کھول دیے۔اور خصوصی طور پر مشرق وسطیٰ کے ممالک کو دعوت دی کہ وہ

سرمایہ کاری کریں۔سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں نے سب سے زیادہ سرمایہ کاری کی اور یہ شخص جو مسلمانوں کو کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کا خواب دیکھ رہا تھا۔سعودی عرب اور خلیج کے علاوہ ایران کا بہترین دوست بن گیا۔اور کشمیر میں ظلم وستم کی انتہا کردی۔یہاں تک کہ چار ہزار سے زیادہ بچوں کی آنکھوں کی بینائی چلی گئی۔جن کو پیلٹ گن کے فائر سے کیے گئے۔اور ان کی آنکھوں کو نشانہ بنایا گیا۔مگر اس سلسلے میں ہمارے سیاستدان جو آزاد فضاؤں میں دورے کرتے تھے۔یہ جاننے سے قاصر رہے کہ یہ شخص اگلا قدم کیا اٹھانے والا ہے۔

اس دوران مودی نے سیز فائر لائن پر گولہ باری اور سویلین آبادی کو نشانہ بنائے رکھا۔اور میڈیا میں پاکستان کو بار بار سبق سکھانے کی دھمکیاں جاری رکھیں۔اس کے دور حکومت میں کشمیر کو مکمل طور پر جیل خانہ بنادیا گیا۔اور پھر یہ اعلان کردیا کہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرکے اس کو انڈیا میں ضم کردیا جائے۔

جو یقیناً اقوام متحدہ کی قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی تھی۔اور کشمیر کے ساتھ دونوں ملکوں کا معاہدہ جس کی بنیاد پر کشمیر کو ایک متنازعہ ریاست کا درجہ حاصل تھا۔مودی سرکار نے ایک سوچے سمجھے منصوبے پر عمل درآمد شروع کردیا۔

پلوامہ خودکشی حملے میں جو اطلاعات کے مطابق "را" کا بنایا ہوا پلان تھا۔جس میں ملٹری کے بڑے کانوائے جموں کے قریب حملہ کیا گیا۔جس میں 50 سے زیادہ فوجی ہلاک ہوئے۔بھارت نے جیش محمد پر الزام لگایا۔مگر اطلاعات کے مطابق یہ کشمیری لڑکا تھا۔جو فوج کی قید میں رہا تھا۔اور فوجی اداروں نے اس کو اپنی حراست میں لے رکھا تھا۔اور اس سے یہ کام کروایا گیا۔چونکہ اس لڑکے کے ساتھ سخت ترین زیادتی کی گئی تھی۔اس لیے انڈین ایجنٹ اس کو اس حملے کے لیے تربیت دیتے رہے۔جب یہ حملہ ہوا،تو اس پر کسی بھی قسم کی تحقیقات یا میڈیکل ڈی۔این۔اے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔اور نہ ہی کوئی میڈیکل رپورٹ فراہم کی گئیں۔کیونکہ الیکشن نزدیک آرہے تھے۔اس لئے مودی نے پاکستان اور کشمیریوں پر دہشتگردی کا الزام عائد کرکے پاکستان پر فضائیہ حملہ کیا۔اور اس فضائی حملے میں انڈیا کا ایک جہاز گرایا گیا۔اور فضائیہ کا پائلٹ گرفتار ہوا۔پاکستان پر سخت ترین دباؤ کی وجہ سے وزیر اعظم عمران خان نے فوری طور پر پائلٹ کو رہا کردیا۔اور یوں مودی دوبارہ علمی میدان میں پوزیشن لے گیا۔مودی کو اس زبردست اور دھمکی آمیز پالیسی کی وجہ سے آخرکار 2019ء کے الیکشن میں تاریخی جیت ہوئی۔جس کی وجہ سے اس نے پہلا کام ہیں کیا کہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کی۔اور مسلمانوں کے لیے شہری حقوق کا نیا قانون بنایا۔جس میں مسلمانوں کو اپنی شہریت کے کاغذات ثبوت کے طور پر پیش کرنے ہونگے۔ورنہ ان کو ملک بدر کیا جا سکتا ہے۔اس وجہ سے کروڑوں مسلمانوں کو انڈیا میں ہراساں کرنے کا سلسلہ شروع کردیا گیا۔آسام سے لاکھوں بنگلہ دیشی باشندوں کو ملک بدر کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔جو صدیوں سے آسام میں رہ رہے ہیں۔اور ان کے خلاف منظّم طریقے سے ملک بدری کی کوششیں جاری ہیں۔یہاں تک کہ اگر کبھی مسلمانوں کو گرفتار کرلیا جائے۔تو انہیں سارا ریکارڈ پیش کرنا ہوگا۔اور جوڈیشل سسٹم بھی یکطرفہ ہے۔اس لیے لوگوں کو انصاف ملنا آسان نہیں۔اس سلسلہ میں 2020ء کے الیکشن میں جب دہلی سے بی۔جے۔پی الیکشن ہار گئی۔تو اس کا الزام مسلمانوں پر لگایا گیا۔اور فرقہ ورانہ فسادات میں مسلم علاقوں کی جائیدادیں اور کاروبار تباہ کردیئے گئے۔اور مسلمانوں کی مدد کے لئے کوئی نہ آیا۔یہاں تک کہ پولیس نے بھی آر۔ایس۔ایس کی مدد کی اور تماشہ دیکھتے رہے۔جب ہندوانتہا پسند آگ لگارہے تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں مودی نے جموں وکشمیر کو الگ یونٹ بنا کر اسے صوبائی حیثیت دے دی۔اور لداخ کارگل کو مرکز کے تحت کردیا گیا۔یوں ریاست جموں وکشمیر کی بین الاقوامی حیثیت کو ختم کرکے کشمیری عوام کو ریاست میں اقلیت بنانے کے لیے باقاعدہ اسٹیٹ سبجیکٹ کا قانون (Domicile law) نافذ کردیا۔جس کے تحت ریاست میں کام کرنے والے تمام باشندوں کو باقاعدہ قانونی حیثیت دے دی جائے گی۔ان کو جائیداد خریدنے اور ووٹ دینے کا حق حاصل ہوگا۔وادی میں مسلمان اکثریت کو اقلیت میں بدلنے کے لئے یہاں نئے آبادکاروں کو لانے کے لیے اقدامات کیے جارہے ہیں۔اس سلسلے میں مودی کو اسرائیل نے ایڈوائزر مہیا کیے ہیں۔جو یروشلم اور مغربی کنارے کے علاقوں میں اسرائیلی آبادیوں میں اضافے کے لیے کیے گئے اقدامات کی بنیاد پر کشمیر میں علم اور ڈوگر آبادیوں کو اقلیت میں بدلنے یا ان کی آبادیوں میں دوسرے علاقوں سے آباد کیے گئے،انڈین شہریوں کے ذریعے ان کو کنارے

لگانے کا کام لیا جائے گا۔اس سلسلے میں حال ہی میں کانگریس سے تعلق رکھنے والے مقبوضہ کشمیر کے سابق وزیر اعلی ڈاکٹر غلام نبی آزاد نے جو راجھہ سبھا میں (ایوانِ بالا) میں اپوزیشن لیڈر ہیں اور انکا تعلق مقبوضہ کشمیر کے ضلع ڈوڈو سے ہے۔انڈیا کی مودی حکومت کی طرف سے مقبوضہ کشمیر کو انڈیا میں ظلم کے بارے میں انڈیا کے ٹی۔ وی چینل کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا! انڈیا کے کشمیر کے بارے میں تمام دعویٰ مکمل غلط ہیں۔انہوں نے کہا! ہندوستان نے انڈیا پارلیمنٹ کے ذریعے کشمیر کو ہتھیانے کا جو طریقہء کار اپنایا ہے۔ وہ انڈیا کے ان تمام اقدامات کو غیر قانونی قرار دیتا ہے انہوں نے کہا کہ انڈین حکومت نے جلد بازی سے آئین میں تبدیلی کر کے تمام آئینی روایات کو بلائے طاق رکھتے ہوئے غلط اقدامات کیے ہیں۔غلام نبی آزاد نے کہا ہے کہ کشمیر کے 22 اضلاع میں سے 21 اضلاع اقدامات کے خلاف ہیں۔غلام نبی آزاد نے کہا ہے کہ مقبوضہ کشمیر میں انڈیا سے توقع کی موت ہو چکی ہے۔اور کشمیر جب تک زندہ ہے۔ایک چلتی پھرتی ڈیڈ باڈی (dead body) ہے۔ان کا کہنا تھا کہ ریاست کو ٹکڑے،ٹکڑے کر کے ریاست کی حیثیت کو کم کر دیا گیا ہے۔حیرت کی بات یہ ہے کہ پوری ریاست کشمیر میں ماسوائے بقیہ لداخ کے شہر جو اس علاقے کا صدر مقام ہے۔کسی اور ضلع نے علیحدگی کی بات نہیں کی۔ بلکہ کارگل نے اس اقدام پر سخت ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ان کا کہنا ہے کہ کشمیری چاہے پیر پنجابی کا ہو، جموں، ڈوڈہ کا ہو، ویلی کا ہو، یا جنوبی کشمیر کا ہو، یا شمالی کشمیر کا ہو، کوئی بھی انڈیا کی ریاست کا حصہ بننے کے لیے تیار نہیں ہے۔اس سلسلے میں موصوف کا

کہنا تھا۔کہ کارپوریشن کے الیکشن میں بارہمولہ سے بی۔ جے۔ پی کے سات امیدواروں نے تین سے سات تک ووٹ حاصل کیے۔اس سے انڈین الیکشن کے بارے میں انڈیا کی جمہوریت کا سارا پول کھل جاتا ہے۔انہوں نے کہا کہ پارلیمنٹ سے بل کی منظوری کا ایک خاص طریقہ کار ہوتا ہے۔مگر اس دفعہ مودی نے طریقہ کار سے ہٹ کر کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کرنے کے لیے جلدی میں بل پاس کروا کر کشمیر کو مکمل طور پر قید خانہ بنا دیا ہے۔اور یہ ہندوستان کی تاریخ کا پہلا ایسا بل ہے۔جو اس طرح پیش کر کے منظور کیا گیا ہے۔یہ اس شخص کا انٹرویو ہے۔جو 2005 سے 2008 تک کشمیر کے وزیر اعلیٰ رہے۔اور اس وقت ایوانِ بالا کے اپوزیشن لیڈر ہیں۔اور ان کا تعلق کانگریس سے ہے۔ یہ مودی کی انتہا پسندانہ کارکردگی کا واضح ثبوت ہے۔اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی کی زندہ مثال ہے۔جس پر غور ضروری ہے۔

حُریت کانفرنس اور اس کی کمزوریاں

2014 سے لے کر انڈیا میں مودی ازم کی پورے ہندوستان کو کنٹرول کرنے کی دوڑ شروع تھی۔اور وزیر اعظم مودی اس سلسلے میں بار، بار یہ ذکر کر چکے تھے۔کہ بھارت کشمیر کو اپنی ریاست کا حصہ قرار دے گا۔اور اس کا خصوصی پوزیشن کا آئینی حق ختم کرے گا۔اس سلسلے میں ریاست میں فوجی کارروائیاں زور پکڑ گئیں۔مگر حریت کانفرنس کی لیڈر شپ دو گروپوں میں تقسیم تھی۔ وہ اس خطرناک سازش کا بروقت ادراک نہ کر سکیں یا انھوں نے ضرورت محسوس نہیں کی۔ کیونکہ ہر ایک نے اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد بنا رکھی تھی۔اور اپنی حدود کے اندر اپنا اثر ورسوخ بڑھا رہی تھی۔اس سلسلے میں میر واعظ عمر فاروق اور سید علی شاہ گروپ اپنے طور پر مسئلہ کشمیر کے بارے میں خیالات کا اظہار کرتے رہے۔مگر ان کی سیاسی بصیرت ان کی ذاتی شخصیات سے آگے نہ بڑھ سکی۔ وہ لوگوں سے قربانی مانگتے رہے اور ان کی قربانیوں پر سیاسی

دکان، آزاد کشمیر کے لیڈروں کی طرح چمکاتے رہے۔مگر عین وقت پر جب ان کی متحدہ آواز کی ضرورت تھی۔وہ اتحاد برقرار نہ رکھ سکے ایک حریت لیڈر بھارت کی زیادتیوں پر جلوس نکالتا رہا۔دوسرا نئی دہلی میں مذاکرات کے نام پر تصاویر اتروا کر واپس اپنے ٹھکانے پر آیا تاکہ اس کی گدی بحال رہے۔اور اس کے حلقہ اثر کے لوگ اس کا ساتھ دیتے رہیں۔اس سلسلے میں ہندوستان کی حکومت نے باقاعدہ منصوبہ بندی سے حریت لیڈران کو تقسیم کیے رکھا۔اور ان کو تقسیم کے ساتھ سخت ترین دباؤ کے تحت ان کی نقل وحرکت کو بھی محدود کروا دیا گیا۔اور وہ صرف گھروں سے پریس ریلیز کے ذریعے، اخبارات کے ذریعے لوگوں سے رابطہ قائم کرتے رہے۔اگر اس نازک وقت میں سارے لیڈران صورتحال کی نزاکت کا احساس کرتے اور متحد ہو کر آواز بلند کرتے تو مودی کو کشمیر کی صورتحال پر اس قدر خطرناک پالیسی اختیار کرنے کی ہمت نہ پڑتی۔ حکومت ہند نے 5 اگست، 2019 سے تمام سیاسی رہنماؤں جن میں بھارت نواز لیڈر شپ بھی شامل تھی ان سب کو قید میں ڈال دیا۔اور تمام کارکنوں اور صحافیوں کی اس طرح ناکہ بندی کر دی کہ وہ کچھ کرنے کے قابل ہی نہ رہیں۔ اس سلسلے میں جب آزاد کشمیر کی حکومت نے کچھ حد تک مزاحمت کا اعلان کیا۔اور وزیر اعظم آزاد کشمیر راجہ فاروق حیدر نے تمام سابق وزیر اعظم حضرات سے زیادہ جراءت مندانہ رویہ اختیار کیا تو وزیر اعظم عمران خان نے فوری طور پر ان کو زیادہ آگے بڑھنے سے منع کر دیا۔را کی اطلاعات کے مطابق اس سلسلے میں وزیر اعظم آزاد کشمیر کو بتایا۔کہ وزیر اعظم پاکستان عمران خان کی اقوام متحدہ میں نمائندگی کے دوران احتیاط سے کام لیں۔ کیونکہ وہ عالمی سطح پر کشمیر کے لئے جنگ لڑ رہے ہیں۔اور یہ جنگ اگر وہ اکیلے لڑیں گے۔اور تصادم کی پالیسی سامنے آئے گی۔تو اس کے اثرات مثبت نہیں ہوں گے۔تقریر میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وزیر اعظم نے امریکا میں 30 ہزار کے لگ بھگ پاکستانیوں کے اجتماع سے خطاب کیا۔ یہ لوگ اعلی تعلیم یافتہ اور امریکہ میں اہم عہدوں پر فائز بھی ہیں۔اور پیشہ ورانہ قابلیت بھی رکھتے ہیں۔ان کو اس اجتماع میں پاکستان کے اندرونی حالات یا سیاست پر بات کرنے کی بجائے کشمیر کی سنگین صورتحال پر بات کرنی چاہیے تھی۔اجتماع میں موجود ایک کشمیری شخصیت نے اجتماع کے فوری بعد راقم کو فون پر بتایا کہ وزیرِ اعظم نے اس طرح ملکی معاملات پر بات کی جس طرح وہ پنجاب کے لوہاری یا بھاٹی کے اجتماع سے خطاب کر رہے ہوں۔انکی اگر یہ تقریر انگریزی زبان میں ہوتی۔اور اگر وہ کشمیر میں ہونے والے ظلم وستم کے بارے میں ہوتی، تو اس کے بین الاقوامی اثرات ہوتے، مگر پاکستان کی اندرونی گندی سیاست کو امریکہ کے شہر میں لا کر موصوف نے ایک سنہری موقع کھو دیا۔ جب کہ مودی سرکار نے انڈین شہریوں کے اجتماع میں جس طرح دہشت گردی کو نشانہ بنایا۔موصوف نے اپنا کام کر دکھایا۔اور عمران صاحب مایوس واپس لوٹے۔ان کی یہ سیاسی غلطی کشمیریوں کے زوال کا نشانہ بنی۔تقریر کے بعد وزیر اعظم جب پاکستان پہنچے تو موصوف نے کشمیریوں کے لیے مایوسی کے تمام دروازے کھول دیئے۔ جب موصوف نے کہا کہ جو کشمیر میں ہتھیار اٹھائے گا گویا وہ پاکستان سے دشمنی کرے گا۔ بھارت اس کو دہشت گردی کا بہانہ بنا کر آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان پر حملہ کرے گا۔اس سلسلے میں وزیر اعظم نے اپنی ذمہ داریاں نبھانے کی بجائے صدر ٹرمپ کے حکم کی تعمیل کی۔اور کشمیر کاز کے ساتھ غداری کے مرتکب ہوئے۔جس کا اظہار مغربی ملکوں میں کشمیریوں نے کھلے عام کیا۔ جب صورت حال مزید خراب ہوگئی تو راقم سمیت بہت سے دوستوں نے وزیر اعظم آزاد کشمیر سے اپیل کی۔ کہ وہ اس سلسلے میں خود نمائندگی کریں۔اور کشمیر کے سلسلے میں آواز بلند کریں۔ چنانچہ

وزیراعظم نے کھلے عام آزاد کشمیر کو بااختیار نمائندہ حکومت کا درجہ دینے کا مطالبہ کیا۔مگر وزیراعظم نے اس سلسلے میں مطالبے کو تسلیم کرنے کی بجائے اشارہ کر دیا۔آزاد کشمیر کو صوبائی حیثیت دینے کے بارے میں عندیہ دے دیا کہ وزیراعظم آزاد کشمیر پر دباؤ بڑھایا جا سکے۔اور اس سلسلے میں ۱۴ ویں آئینی ترمیم کا اشارہ دے دیا۔مغربی ملکوں میں تحریکِ کشمیر برطانیہ، کشمیر سولیڈریٹی کونسل کے چیئر مین جاوید راٹھور صاحب سمیت دیگر اراکین پورے یورپ اور امریکہ سمیت خلیجی

ریاستوں میں بھی مسئلہ کشمیر پر کام کرتے رہے۔ ہمارے بعض عزیز جن کا تعلق باغ آزاد کشمیر سے ہے۔ یو۔اے۔ای میں کام کرنے والے اکثر صحافی حضرات انفرادی اور اجتماعی سطح پر نیوز میڈیا کو کشمیر کی اہم خبریں بذات خود جا کر آفس میں دیتے رہے۔ مجھے علم ہے کہ جب عمران خان نیویارک میں تھے۔ایک دوست نے مجھے کہا کہ آپ مجھے کشمیر کی موجودہ صورتحال پر ایک مضمون بھیج دیں۔تا کہ میں چند اخبارات کو بھیج سکوں۔ چند گھنٹوں بعد میں نے جب ان کو مضمون بھیجا تو یہ مضمون انہوں نے عرب میڈیا کو بھیجا۔ اور اسی مضمون کی مدد سے بہت سے اخبارات میں کشمیر کے بارے میں مضامین شائع کیے گئے۔اس طرح یو۔ایس میں کشمیری کمیونٹی نے مظاہروں کے ذریعے مسئلے کو اٹھایا۔ان کی کارکردگی قابل فخر تھی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کشمیر پر سیاست نہیں کرتے۔ بلکہ اپنا فرض سمجھ کر دن رات کوششیں کرتے ہیں۔مگر آزاد کشمیر اور پاکستان کی پی۔ٹی۔آئی گورنمنٹ نے اس نازک صورتحال میں پاکستان اور کشمیر دونوں سے غداری کی۔ اور تاریخ انہیں کبھی معاف نہیں کرے گی۔ جب کشمیریوں کو پاکستان کی مدد کی ضرورت تھی۔اس وقت ایک انتہائی نااہل وزیراعظم نے پوری قوم کا بیڑہ غرق کر دیا۔ان کی تقاریر اور بیانات پر بہت سے افراد کو آنسو بہاتے دیکھا گیا۔مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔مودی اپنا کام کر چکا تھا۔اور اسے علم تھا، کہ اسلام آباد میں ایک ایسا شخص حکمران ہے۔ جو سیاست کی ابجد سے بھی واقف نہیں۔ وہ کچھ نہیں کر سکے گا۔اور اس دوران آزاد کشمیر کے بعض لیڈران کو دیکھ کر افسوس ہوا۔جو مکمل خاموش رہے۔

بھارت کی مسئلہ کشمیر کو غلط راستے پر ڈالنے کی کوشش

بھارت نے مغربی ممالک کے بیشتر شہروں میں ساؤتھ ایشین نام کی تنظیم قائم کر دی۔اور ان تنظیموں کو خود بھی مختلف ذرائع سے فنڈز مہیا کئے۔اور ان کے ذریعہ آزاد کشمیر کے بہت سے لیڈران اور سیاسی کارکنوں سے روابط قائم کئے۔اس سلسلے میں برطانیہ، امریکہ اور کینیڈا میں مختلف تنظیمیں سامنے آئیں۔ مجھے یاد ہے کہ مانٹریال میں بھی ایک ایسی ہی تنظیم تھی۔ جس کے سربراہ ایک پروفیسر تھے۔ جنہوں نے مختلف سیمیناروں کے ذریعے کشمیر میں دہشت گردی کے بارے میں آواز بلند کی۔اس سلسلے میں پاکستان سے ان لوگوں کو دعوت دی جاتی۔ جو پاکستان کے خلاف باتیں کرتے۔اس سلسلے میں عاصمہ جہانگیر سمیت مختلف شخصیات وزراء مہمان رہیں۔ایک دفعہ میں بھی ان کی دعوت پر سیمیناروں میں گیا۔جب کہ کارگل کی لڑائی شروع ہوئی۔ اور موصوف نے اپنے نمائندوں میں بہت سے کشمیری پنڈتوں اور دوسرے ہندوستانیوں کو بھی دعوت دی۔ یہ بات میری سمجھ میں اس وقت آئی۔ جب کھٹمنڈو کشمیر کانفرنس میں اس سلسلے میں راقم کو تنظیم کی طرف سے شرکت کرنے کی دعوت دی تھی۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ اس سے آپ کی تنظیم کو کیا فائدہ ہوگا؟ تو کہنے لگے! میں خود مختار کشمیر کا حامی ہوں۔لبریشن فرنٹ کے لیڈر یٰسین ملک سے بھی مل چکا ہوں۔صرف آپ نے وہاں کھلے عام خود مختاری کی بات کرنی ہوگی۔ بات خود مختاری

کی نہیں تھی بلکہ بھارت، کشمیری باشندوں کو تقسیم کرنے کا حامی تھا۔اس سلسلے میں لداخ کے ایک ضلع کے بدھ مت کے پیروکاروں کو وادی کے لوگوں کے خلاف اکسایا گیا۔ اور جموں، کٹھوعہ اور ادھم پور کے ڈوگروں کو بھارت کی حمایت پر تیار کیا گیا۔اور ان سے کہا گیا۔ کہ وادی کے لوگ آپ کا استحصال کر رہے ہیں۔ پھر جموں کے گوجر، بکروال لوگوں کو وادی کے مسلمانوں کے خلاف کیا گیا۔ اور بھارت اور انکی ایجنسیوں نے بہت سے ایسے ورکر بنائے، جو بھارت کی مدد کرتے رہے۔ جب مجھے اس صورتحال کا علم ہوا کہ کس طرح یہ تنظیم ایسے لوگوں کو دعوت دے رہی ہے جو دراصل کشمیری عوام کے درمیان دیارِ غیر سے ایجنٹ تیار کر کے تقسیم پیدا کرنا چاہتے ہیں۔تو راقم نے ان کی دعوت ٹھکرا دی۔ اور ان سے کہا۔ جناب مجھے کھٹمنڈو کانفرنس میں جانے کا کوئی شوق نہیں ہے۔اس کے بعد موصوف نے راقم کو کبھی کسی کانفرنس میں شرکت کی دعوت نہیں دی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ امریکہ، کینیڈا اور برطانیہ میں اور یورپ کے دیگر ممالک میں ہونے والے دوروں کی سرپرستی کرنے والے ان اداروں کے ذریعے آزاد کشمیر کے لیڈران کو دعوت دیتے رہے۔ بعد ازاں جب انکشافات ہونے لگے کہ آزاد کشمیر کے بعض لیڈران ان ایجنسیوں سے فنڈنگ وصول کر رہے ہیں۔تو بعض لیڈران ڈر کے مارے خاموشی سے ان تنظیموں سے الگ ہو گئے۔ان تنظیموں نے جموں میں بھی ایک ایسی کانفرنس کا انعقاد کیا تھا جس میں آزاد کشمیر سے بھی بعض لیڈران اور سیاسی کارکن گئے تھے۔اس سے بھارت نے فائدہ اٹھایا۔ کہ یورپ اور نارتھ امریکہ سے بعض نوجوانوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔اور یوں ان کے ذریعے کشمیریوں میں تقسیم کی نئی مہم چلائی گئی۔اس طرح یورپ اور پاکستان میں بھی لبریشن فرنٹ کی درجن بھر تنظیمیں بن گئیں۔اور کشمیری ایک کاز پر متحد ہو کر کھڑے ہونے کے قابل نہ رہے۔ بھارت نے ان ملکوں میں اپنی کارکردگی دکھائی۔ وہاں پاکستان کے بڑے شہر کراچی سے ایک سیاسی تنظیم نے اپنی رہی سہی کسر پوری کر دی۔اور پاکستان کی منظّم خارجہ پالیسی نہ ہونے کی وجہ سے بھارت ہر میدان میں پاکستان پہ سبقت لے گیا۔یہی وجہ ہے کہ جب مودی نے کشمیر پر آخری وار کیا تو پاکستان اور کشمیری لیڈر شپ اس کے لیے بالکل تیار نہ تھے۔ کشمیری لیڈران تو اس سودہ کار ایجنٹ تھے۔آزاد کشمیر کے چند بڑے سیاست دان تارکینِ وطن کے ایک سیٹ کے لیے کروڑوں روپے وصول کرتے رہے۔اور اعزازی مشیر بنا کر برطانیہ کے کشمیری نژاد شہریوں کو لوٹتے رہے۔ان کو تو اس بات کا احساس ہی نہ تھا کہ کشمیر میں کیا ہونے والا ہے۔اور نہ ہی ان کو اس کی کچھ پروا تھی مگر پاکستانی وزیراعظم جو صرف بلے بازی میں ماہر تھا۔ بھارت کی چالبازیوں کے آگے ہار گیا۔اور ایسے ایسے بیانات دیے۔ کہ خود کشمیر کے اندر بدترین لاک ڈاؤن میں لوگوں کو سخت ترین مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔

دنیا کا کنٹرول ۲۰ خاندانوں کے ہاتھ میں ہے

اس بات سے کسی کو کوئی اعتراض نہیں کہ دنیا کا کنٹرول ۲۰ کے قریب انتہائی طاقتور خاندانوں کے پاس ہے۔جن کی دولت کا اندازہ یہ ہے کہ آدھی دنیا کی دولت ان کے پاس ہے۔ان خاندانوں کی دولت کا کنٹرول یہودی بینکوں کے ہاتھ میں ہے۔جس کا کنٹرول روتھ چائلڈ خاندان کے پاس ہے۔جس کے اثاثوں کا کسی کو اندازہ ہی نہیں ہے۔ یہ خاندان پوری دنیا کے بینکوں میں اپنا حصہ رکھتا ہے۔اور بڑے، بڑے کاروباری خاندان اور کرپٹ حکمرانوں کی دولت کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ جب تک ان خاندانوں کی

سرمایہ کاری کو خطرہ نہ ہو۔اس وقت تک یہ مداخلت نہیں کرتے۔مگر جوں ہی ان کو خطرہ درپیش ہو کہ ان کی سرمایہ کاری کو خطرہ ہے۔تو یہ خاندان حرکت میں آجاتے ہیں۔کہ کس ملک کو بحران سے دوچار کرکے مفادات حاصل کرنے ہوں تو وہ کسی بھی ملک کو،اس ملک کے خلاف اقدامات کرنے کے لئے تیار کرسکتے ہیں۔اور دنیا میں خانہ جنگی کروادیتے ہیں۔یہاں تک دو عالمی جنگوں کے پیچھے بھی ان خاندانوں کا ہاتھ رہا ہے۔جس پر درجن بھر کتابیں بھی دنیا میں سامنے آچکی ہیں۔ان خاندانوں نے کس طرح بحران پیدا کرکے ساری دنیا کو مصائب سے دوچار کیا۔اور اس کے عوض کھربوں ڈالر کا منافع کمایا۔دوسری جنگ عظیم میں روتھ چائلڈ خاندان نے برطانیہ اور فرانس کے علاوہ جرمنی کے بھی سیاستدانوں کی مدد کی۔کہا جاتا ہے،کہ اسرائیل کا قومی جھنڈا روتھ چائلڈ خاندانوں کے جرمن میں قائم بینک کا جھنڈا تھا۔اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ خاندان کس قدر طاقتور ہیں۔ان خاندانوں میں ۱: والٹن فیملی آف وال مارٹ، (Walton family)،۲۔مارس فیملی آف وال مارٹ،۳۔کاچ برادرز ز، (Koch brothers)،۴۔آل سعودی فیملی،۵۔رتھ ہمائیر فیملی،۶۔ڈوماس فیملی،۷۔بوہرنگر فیملی، (Boehrnger family)،۸۔کارگل فیملی آف یو۔ایس،۹۔روتھ چائلڈ فیملی،۱۰۔بل گیٹس، ۱۱۔بوفیٹ فیملی،۱۲۔بی زوز فیملی (Bezoz family)۔یہ وہ لوگ ہیں جن کے سرمایہ کو آگے بڑھانے والے بینک اور دوسرے ادارے ان کے اشاروں پر کام کرتے ہیں۔اور ورلڈ بینک اور آئی۔ایم۔ایف ان کی زیر سرپرستی کام کرتے ہیں۔اور ان کے سرمایہ پر قرضے فراہم کرتے ہیں۔یہ دولت مند خاندان اور ان کے بینک دنیا کے نظام کو اندر سے چلاتے ہیں۔اور اکثر ملکوں کے حکمران ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں۔جس طرح ہمارے ملک کے وزیر اعظم اقوام متحدہ میں آنے سے پہلے سعودی عرب تشریف لے گئے۔اور پھر شہزادہ سلمان کے پرائیویٹ جہاز پر امریکہ وارد ہوئے۔ظاہر ہے ان کی خاصی آؤ بھگت کی گئی۔کیونکہ اس خاندان نے امریکہ میں کئی سو بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کررکھی ہے۔اصل میں مسئلہ کشمیر ہو یا کوئی اور مسئلہ ہو،جب تک کہ اس مسئلہ کے حل کے لیے کوئی ایک فریق آخری حد تک جانے کے لیے تیار نہ ہو،اس وقت تک دنیا اس کا نوٹس نہیں لے گی۔یہ ایک حقیقت ہے اور آخری حد تک جانا اتنا آسان نہیں۔کیونکہ بھارت اور پاکستان دونوں ملکوں میں ان خاندانوں نے سرمایہ کاری کررکھی ہے۔اور عالمی بینک بھی ان کی رضامندی سے ہی قرضہ دیتا ہے۔

انور ایوب راجہ صاحب آف برطانیہ

برطانیہ کے دوروں کے دوران بہت سے لوگوں سے رابطے کا موقع ملا،مگر بہت سے دوست میری واپسی پر مجھ سے رابطہ قائم کرتے رہے۔ان میں برطانیہ کی نامور شخصیت انور راجہ صاحب تھے۔انور ایوب راجہ صاحب ایک اہم کہانی نویس،تاریخ دان،صحافی اور آزاد کشمیر کے اہم تاریخی واقعات پر تحقیقات کرتے رہے۔اور برطانیہ میں کشمیر کی نمائندگی کرنے والوں اور مختلف افراد کو میڈیا میں متعارف کروانے والوں میں شامل تھے۔یہ وہ لوگ ہیں جو خاموش آواز بلند کرنے والوں میں سے ایک ہیں۔موصوف آزاد کشمیر کی نامور شخصیات سے روابط کے باوجود کبھی کسی شخص کے ذریعے اختیارات کی زینت بننے کے لیے تیار نہیں تھے۔اور اکثر کشمیر کے معاملات کو آگے بڑھانے کے لیے مقامی افراد کو میڈیا میں متعارف کرواتے رہے۔ان سے میرا رابطہ گزشتہ کئی سالوں سے بذریعہ میڈیا لنک رہا۔اور پھر فون کے ذریعے بھی روابط

بڑھاتے رہے۔موصوف نے اس سلسلے میں کشمیر کی پرانی تاریخی گمشدہ کہانیوں کو سامنے لانے کی کوشش کی۔وہ سابق ضلع میرپور آزاد کشمیر سے تعلق رکھتے ہیں۔اور اکثر میرپور سے برطانیہ آنے والوں کی زندگی اور حالات پر لکھتے رہے۔اور میرپور کے اہم تاریخی واقعات کو کہانیوں کی صورت میں سامنے لاتے رہے۔وہ انتہائی اعلیٰ پایہ کے صحافی ہیں۔اور ماڈرن میڈیا لنک میں بھی ماہر ہیں۔اور ترجمہ کے ماہر ہیں۔موصوف ہر معاملے میں کشمیر پر اکثر بذریعہ میڈیا آگے بڑھتے رہے۔اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر کشمیر پر لگاتار مشورے دیتے رہے۔اس قسم کے بے شمار لوگ مغرب میں انتہائی خاموشی سے اپنا فرض ادا کررہے ہیں۔اور تحریک آزادی کشمیر کے سلسلے میں ان کی تحریریں اور جدوجہد آزادی کی تحریک میں میرپور کی نامور شخصیات کے بارے میں تاریخی تحقیقات انتہائی قابل تعریف ہیں۔وہ بہت سی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔اسی قسم کی شخصیات ہمارے لیے انتہائی اہم ہیں۔موصوف اس سلسلہ میں آزاد کشمیر کی اہم شخصیات کو ہمیشہ تحریک آزادی کشمیر کے بارے میں مشورے دیتے رہے۔اور ان کے ساتھ راقم کے روابط بعض اہم معاملات میں اکثر ان سے مشورہ لیتا رہا۔موصوف جیسے تاریخی لوگ ہمارے لیے بہت ہی قیمتی اثاثہ ہیں۔

آزاد کشمیر کی لیڈرشپ۔

مقبوضہ کشمیر حریت کانفرنس چند شکایتیں اور چند حقائق۔

مقبوضہ کشمیر میں حریت کانفرنس کی قیادت کے بارے میں جاننے سے پہلے چند تاریخی حقائق کے بارے میں بتانا بہت ہی ضروری ہے۔سب سے پہلے یہ بات بتانا ضروری ہے،کہ قائداعظم محمد علی جناح مرحوم نے مہاراجہ کے ساتھ ایک معاہدہ (سٹینڈسٹل) کے تحت مہاراجہ کو وقت دیا تھا۔کہ وہ کشمیر کو خودمختار ریاست بنانے کے حق میں ہے یا کشمیر کے پاکستان کے الحاق کے سلسلے میں مشاورت کرنا چاہتے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ کشمیر کی ریاست کے معاملات کا فیصلہ،باہم مشاورت سے کیا جانا چاہیے۔کیونکہ ریاستوں کو یہ حق حاصل تھا کہ وہ خودمختار رہیں یا دونوں ملکوں میں سے کسی ایک ملک کے ساتھ اتحاد کریں۔بدقسمتی سے قائداعظم محمد علی جناح کی صحت حد سے زیادہ خراب تھی۔اور پاکستان کے وزیراعظم لیاقت علی خان اور کابینہ کے افراد اکثر ان سے کسی بھی معاملہ میں مشاورت کرنے کی بجائے خود ہی فیصلے صادر کردیتے تھے۔یہی وجہ ہے کہ اس بحرانی دور میں قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کی صحت کی خرابی کی وجہ سے کوئی متبادل قیادت اس قابل نہ تھی کہ وہ باہمی مشاورت سے آگے بڑھ سکے اس سلسلے میں حکومت پاکستان کے اختیارات انگریزوں کے غلام پنجاب کے جاگیرداروں کے پاس چلے گئے۔وزیراعظم لیاقت علی خان بھی مزاج کے اعتبار سے جاگیردار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔اس لیے وہ اپنی ٹیم میں خاصے مطمئن نظر آئے۔اور انہوں نے دور اندیشی سے مسائل کا ادراک کرنے کی بجائے اپنے اردگرد مشیروں اور وزراء کے مشوروں پر عمل کرنا شروع کردیا۔اور سب سے پہلے خاموشی سے آزاد حصے کے ایک بڑے علاقے جسے شمالی علاقہ جات کا نام دیا جاتا تھا۔یہ علاقے گلگت، بلتستان کے وسیع علاقے تھے۔جن کو بغیر عوام کی آراء لئے ۲۸ اپریل ۱۹۴۹ء کو مسلم کانفرنس اور حکومت آزاد کشمیر کے درمیان ایک معاہدے کے تحت ان علاقوں کا اختیار مکمل طور پر حکومت پاکستان کے حوالے کردیا گیا۔اور ان علاقوں کے کسی بھی سیاسی رہنما یا ان علاقوں کے ان فوجی افسران سے بھی مشورہ نہیں کیا گیا،جنہوں نے قربانیاں دے کر ان علاقوں کو آزاد کروایا تھا۔کراچی کے اس معاہدہ

پر دستخط کرنے والے افراد میں مندرجہ ذیل افراد شامل تھے۔ جنہوں نے خطہ کشمیر کی عوام سے غداری کی۔ اور کشمیر کے اس علاقے کو ایک نمائندہ حکومت بنا کر عالمی سطح پر کشمیر کی جدوجہد آزادی اور اس کے حل کے لئے مناسب امداد کے حصول کی کوششیں کرنے کی بجائے اس علاقے کی حیثیت کو مکمل طور پر ختم کر دیا۔

مندرجہ ذیل افراد اس بھیانک

معاہدے کو مرتب کرنے میں شامل رہے۔ جن کی غلط پالیسی کی وجہ سے کشمیر کے عوام سنگین ترین بدحالی اور ظلم وستم کا شکار رہے۔

مشتاق احمد گورمانی:۔ جو ایک انتہائی بد دماغ اور بدکردار انسان تھا۔ جس کا پاکستان اور کشمیر کے معاملات میں کوئی اہم کردار نہ تھا۔ جس نے پونچھ کے عوام سے اسلحہ واپس لے کر جدوجہد آزادی کو ختم کیا۔

سردار محمد ابراہیم خان صاحب:۔ جنہوں نے قائداعظم محمد علی جناح مرحوم کے احکامات اور معاہدہ کے باوجود بغیر کسی مشاورت کے پونچھ میں اعلان جنگ کیا۔ اور اس کے لیے فوجی کمانڈروں کے مشوروں پر عمل کرنے کی بجائے جنگ بندی کو ترجیح دی۔ اور معاہدہ کرنے کے لیے عوام سے مشورہ لینا ضروری نہ سمجھا۔

چوہدری غلام عباس مرحوم:۔ جنہوں نے خاص وقت میں نے اپنے اعزازات کو برقرار رکھنے کے لیے اس مسئلے پر آواز بلند کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ موصوف مسلم کانفرنس کے صدر تھے۔ اور ان کو اس سلسلے میں کھل کر اظہار خیال کرنا چاہیے تھا۔ مگر موصوف نے اس سلسلے میں کسی قسم کی آواز بلند نہ کی۔ حیرت کی بات تو یہ ہے۔ کہ اس معاہدے کے بارے میں خبر اخبار تک نہ آنے دی گئی۔ اور اس کی تفصیلات بہت عرصہ تک عوام کی نظروں سے اوجھل رہیں۔ شاید ان دونوں رہنماؤں نے اپنی عزت بچانے کے لئے خفیہ طور پر حکومت پاکستان سے معاہدہ کیا تھا کہ اس معاہدہ کو سامنے نہ آنے دیا جائے۔

اس معاہدہ کو سامنے لانے کا کام اس وقت سامنے آیا۔ جب گلگت و بلتستان کے سلسلے میں ایک کیس کا فیصلہ ہوا۔ جس کا آزاد کشمیر ہائیکورٹ میں فیصلہ دیا گیا۔ جس میں یہ بتایا گیا کہ یہ معاہدہ ۲۸ اپریل ۱۹۴۹ء کو کیا گیا۔ اور اس سلسلے میں

Appendix xvII of the constitution of Azad Jammu and Kashmir by justice Syed Manzoor Hussain Gilani

اس کو ۲۰۰۸ء میں شائع کیا گیا ہے۔ یہ معاہدہ پاکستان کے حق میں تھا۔ جس میں آزاد حکومت کے اختیارات مکمل طور پر ختم کر دیئے گئے تھے۔ اور سارے اختیارات وزارت امور کشمیر کے جائنٹ سیکرٹری کے حوالے کر دیئے گئے۔ اس میں عالمی معاملات میں آزاد حکومت کو آواز اٹھانے کے اختیارات واپس لے لیے گئے۔ اور خارجہ پالیسی اور دفاع سمیت تمام اختیارات حکومت پاکستان نے اپنے پاس لے لیے۔ اور اس سلسلے میں آزاد کشمیر میں فوج اور دیگر اختیارات حکومت پاکستان کے حوالے کر دیئے گئے۔ اور بھارت سے مذاکرات کے سلسلے میں حکومت پاکستان کی اتھارٹی کو تسلیم کیا گیا۔ اور آزاد کشمیر کی فورسز کو پاک آرمی میں ضم کر دیا گیا۔ اور آئندہ کسی بھی قسم کی مشاورت کے لیے آزاد کشمیر کے سیاست دانوں کو منسٹر آف امور کشمیر کے ساتھ رابطہ کرنے کے لیے کہا گیا۔ گو یہ آزاد کشمیر کی حیثیت ایک لوکل گورنمنٹ کی کر دی گئی۔ چنانچہ اس معاہدے کے بعد جوائنٹ سیکرٹری امور کشمیر عملی طور پر آزاد کشمیر کا مالک بن گیا۔ سردار ابراہیم خان گلگت و بلتستان کے وسیع علاقے کو آزاد کشمیر سے الگ کر کے ایک پولیٹکل ایجنٹ کے حوالے

کرنے کا عارضی معاہدہ کرنے کا سبب یہ بتایا۔ کہ آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان کے درمیان آزاد علاقے سے روابط اچھے نہیں۔ ذرائع آمدورفت انتہائی مشکل راستوں سے جاتے ہیں۔ اور سردیوں میں روابط قائم رکھنا مشکل ہوگا۔ اسی لئے پاکستان، راولپنڈی اور پشاور کے راستے آسانی سے علاقوں کا انتظام سنبھل سکتا ہے۔ مگر ان لیڈران کی اپنے وطن سے غداری پر آج تک کشمیری عوام ظلم وستم سے دوچار ہے۔

اور بھارت نے وہی تقسیم کا طریقہ کار مقبوضہ کشمیر میں بھی شروع کیا۔ اس سلسلے میں پونچھ کے مایہ ناز لیڈر امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی شیر پونچھ جو چودھری غلام عباس مرحوم سے بھی سینئر ترین لیڈر تھے۔ ان کو اس سارے منصوبے سے دور رکھا گیا۔ اور ان سے کسی بھی قسم کے مشورے کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ مگر آزاد کشمیر کے سیاسی کارکنوں جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ جن میں امان اللہ خان مرحوم شامل تھے۔ گلگت و بلتستان میں غیر آئینی اقدامات کے خلاف سخت ترین آواز اٹھائی اور ان کے بہت سے کارکن گرفتار بھی ہوئے مگر آزاد کشمیر کی حکومت نے گلگت بلتستان پر کئے گئے اپنے لیڈران کی غلطیوں کے باوجود احصّے پر اپنا حق برقرار رکھنے کیلئے جدوجہد جاری رکھی اور ۱۹۷۲ء میں آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی گلگت وبلتستان کو آزاد کشمیر کا حصہ قرار دینے کیلئے قرارداد منظور کی اور ۱۹۷۴ء کو آزاد کشمیر کے آئین (1974 interm constitution) میں گلگت و بلتستان کو آزاد کشمیر کا حصّہ قرار دیا۔ چنانچہ اس آئینی اصول پر باقاعدہ آزاد کشمیر ہائیکورٹ میں رٹ دائر کی گئی۔ اور آزاد کشمیر ہائیکورٹ نے حکم دیا کہ حکومت گلگت وبلتستان کا چارج سنبھال لے۔ مگر اس حکم کو سپریم کورٹ میں اپیل کے لیے پیش کیا گیا۔ جہاں سپریم کورٹ آزاد کشمیر نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو معطل کر دیا۔ مگر اس بات کو تسلیم کیا۔ کہ یہ علاقے آزاد کشمیر کا حصہ ہیں۔ گلگت وبلتستان کے جہاد آزادی کے ویژن میں کیپٹن مرزا حسن خان گلگت وبلتستان میں تعینات تھے۔ وہ انڈین آرمی میں ڈیرہ دون میں کمیشن آفیسر کی تربیت کے بعد ڈوگرہ فورسز میں افسر بنے۔ اور گورنر گھنسارا سنگھ کی مدد کے لیے بھیجے گئے تاکہ وہ گھنسارا سنگھ کی معاونت کر سکیں۔ کیونکہ موصوف گلگت سکاؤٹس پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ مگر جب بغاوت شروع ہوئی تو مرزا حسن خان نے ولیم براؤن کی حمایت کی۔ جو گلگت سکاؤٹ کا انچارج تھا۔ اور گورنر کے اقدامات کے سخت خلاف تھا۔ چنانچہ کیپٹن مرزا حسن خان نے نہایت ہی چابکدستی سے اپنے ساتھیوں کی مدد سے پورے نارتھ کشمیر کو آزاد کروا دیا۔ اور کیپٹن مرزا حسن خان کو بعد ازاں علاقے کا ٹائیگر فورس کا انچارج بنا دیا گیا۔ اور ان کو ایک علاقے تک محدود کر دیا گیا۔ 1963ء میں مرزا حسن خان نے گلگت لیگ بنائی تاکہ علاقے میں جمہوری روایات کو پروان چڑھایا جا سکے۔ اور گلگت میں ترقی کے لئے پیش رفت کی جا سکے۔ لیکن ایوب خان کی حکومت نے پارٹی کو غیر قانونی قرار دے دیا۔ پھر موصوف نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کی تاکہ جمہوری حکومت کے بعد اس علاقے کو حقوق حاصل ہوں۔ مگر موصوف کو ذوالفقار علی بھٹو نے 1973ء میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا۔ اور موصوف کو سخت ترین جسمانی اور ذہنی دباؤ سے گذرنا پڑا۔ اس دوران آزاد کشمیر سے کسی سیاسی لیڈر نے ان کی مدد نہ کی۔ حالانکہ موصوف آزاد کشمیر کے سب سے بڑے علاقے کو آزاد کروانے والے قائد تھے اس دوران یہ علاقہ پسماندگی سے دوچار رہا۔ اور علاقے میں سکولوں، کالجوں اور میڈیکل سہولتوں کی بحالی کے لئے آغا خان فاؤنڈیشن کے ذریعے ترقیاتی کام ہوئے۔ اور پرنس کریم آغا خان نے اپنے فرقہ کو بڑھانے اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے وہاں کے دورے کیے۔ اور مختلف

ملکوں سے فنڈ حاصل کیے۔ گواس سلسلے میں یہ وہ واحد تنظیم تھی جس نے لوگوں کو بنیادی سہولتیں فراہم کیں۔ اس دوران بے شمار لوگ ترقیاتی کاموں کا مطالبہ کرنے پر گرفتار کئے گئے۔ اور جیلوں میں زندگی گذارنے پر مجبور ہوئے۔ یہ سب کشمیریوں کی بدقسمتی تھی کہ ان کو نابالغ قیادت نے 1952ء کے بعد غلط راستے پر لگا کر اپنے لئے تو دولت کمائی اور بڑے بڑے گھر اسلام آباد اور راولپنڈی میں بنوائے۔ اربوں کی دولت اکٹھی کی مگر کشمیریوں کو کئی حصوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ چنانچہ انڈیا نے بھی وہی اقدام کیا۔ اور 5 اگست 2019ء کو انڈیا نے کشمیر کی خصوصی حیثیت معطل کر کے لداخ کو گلگت و بلتستان کی طرح مرکز کے حصہ میں شامل کر لیا۔ اور یوں اس معاہدہ کراچی کو بنیاد بنا کر بھارت نے کشمیر کو مزید تقسیم کرنے کا منصوبہ بنا کر پورے علاقے کو 73 سال کے بعد ایک نئے بحران سے دوچار کر دیا۔ اور یوں اب چین بھی اس علاقے میں اپنا قبضہ جما کر بیٹھ گیا۔ یہ تین ایٹمی طاقتوں کے لیے اب مسئلہ بن چکا ہے۔

1947ء میں پونچھ بغاوت اور آزاد علاقے کا قیام

1947 ء میں ایک طرف مہاراجہ کے ساتھ قائد اعظم محمد علی جناح صاحب مرحوم نے جوں توں (Stand still) معاہدہ کر کے بھارت کو کشمیر میں مداخلت کرنے سے روکنے کی کوششیں کیں۔ تو دوسری طرف مہاراجہ کشمیر کو موقع فراہم کیا کہ وہ سوچ سمجھ کر کشمیر کے بارے میں فیصلہ کرے اور ریاست کی ساری آبادی کے ساتھ مشاورت کرے۔ اس سلسلے میں کچھ مہاراجہ کی ناقص پالیسیوں اور کچھ آزاد کشمیر کی نوجوان قیادت کے غلط فیصلوں سے صورتحال میں خرابی آئی۔ راقم نے جب اس سلسلے میں غازی ملت سردار ابراہیم صاحب کا انٹرویو لیا تو ان کا کہنا تھا کہ آزاد کشمیر میں اقتدار کی جنگ اس وقت شروع ہوگئی تھی۔ جب پاک بھارت سیز فائر ہوا۔ اور معاملہ اقوام متحدہ میں چلا گیا۔ واپسی پر مجھے برخاست کر دیا گیا۔ کیونکہ اس وقت آزاد کشمیر کے انچارج مشتاق احمد گورمانی کو سردار قیوم صاحب کی صورت میں ایک ایسا شخص مل گیا تھا۔ جو اقتدار کے لئے کچھ بھی کر سکتا تھا۔ پھر پاکستان کی غیر قانونی کارروائی پر چوہدری غلام عباس مرحوم بھی خاموش رہے۔ ان کو بھی لیڈری عزیز تھی۔ گویا معاملہ کرسی تک پہنچ گیا تھا۔ اور میرے قبیلے کے لوگ اس زیادتی کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ کیونکہ پونچھ میں اس قبیلے اور امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی شیر پونچھ کی جدوجہد کو تاریخی حیثیت حاصل تھی۔ اور اس بحرانی دور میں آزاد کشمیر سے واحد شخصیت امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی کی تھی، جنہوں نے صورت حال کا بغور جائزہ لے لیا تھا۔ ان کی نظر میں حکومتِ پاکستان کشمیریوں سے جان چھڑانا چاہتی ہے۔ اور کشمیر کے آزاد حصے کو مدغم کر کے بھارت کے ساتھ ڈیل کرنا چاہتی ہے۔ یہ ان کا کہنا تھا۔ مگر اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ پونچھ کی عوام نے آزادی کے لیے جو قربانیاں دیں تھیں۔ وہ صرف اپنے علاقے تک محدود نہیں تھیں۔ وہ پورے کشمیر کو ایک ساتھ آزادی دلانے اور باہمی مشاورت سے ریاست کے مستقبل کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے اور اس عمل میں رکاوٹ آزاد کشمیر کا بنایا گیا انچارج مشتاق احمد گورمانی تھا۔ جو قدم، قدم پر اپنے ایجنٹوں کے ذریعے تحریک آزادی کشمیر کو غلط راستے پر ڈالنے کا پروگرام بناتا رہا۔ حکومت پاکستان میں قائد اعظم جیسے دور اندیش لیڈران نہیں تھے۔ اس لئے انہیں صرف اپنے علاقے سے غرض تھی، جو ان کو مل گیا تھا۔ جن میں شمالی کشمیر کا وسیع علاقہ بھی شامل تھا۔ جس کی سرحدیں چین سے ملتی تھیں۔ چنانچہ پونچھ میں دو شخصیات جن میں سردار ابراہیم خان صاحب اور ان کے سرپرست اور انتہائی اعلیٰ پائے کے

لیڈر امیر شریعت مولانا عبداللہ گڑھوی ان کو ہر میدان میں مشاورت فراہم کرتے رہے۔ ان کے خطوط بذریعہ قاصد سردار صاحب کو پہنچائے جاتے رہے۔ سڑکوں کا نظام نہیں تھا۔ اس سلسلے میں ان کے قاصد حضرات کی تعداد 20 کے لگ بھگ تھی۔ جو خط لے کر پیدل جاتے تھے۔ اور واپس خط لاتے تھے۔ ۱۹۵۰-۱۹۵۱ء میں آزاد کشمیر میں متوازی حکومت کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یہ متوازی حکومت (Parallel government) سردار محمد ابراہیم خان کی صدارت سے برطرفی کی وجہ سے پونچھ میں عمل میں آئی۔ اور یہ صورتحال اس وقت کچھ حد تک کم ہوئی جب وزیر اعظم لیاقت علی خان کو شہید کر دیا گیا۔ اس سلسلے میں سدھنوتی میں سدھن قبیلہ نے پورے علاقے میں بغاوت کی اور باغ میں امیر شریعت وادی کشمیر کے اہم لیڈر تھے۔ جنہوں نے نہ صرف سردار ابراہیم صاحب کی حمایت کی، بلکہ باغ میں متوازی حکومت قائم کی۔ اور حکومت پاکستان کو چیلنج کیا کہ اگر مذاکرات کا عمل شروع نہ کیا گیا۔ تو اب یہ سرحدیں بدل سکتی ہیں۔ اس جدوجہد میں ہزاروں افراد گرفتار ہوئے اور آخر کار سدھن قبیلہ نے مولانا عبداللہ کفل گڑھوی مرحوم کو ثالث مقرر کیا۔ تاکہ مذاکرات کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ سب سے افسوسناک واقعہ یہ ہوا کہ پورے پونچھ کے لوگوں سے اسلحہ جمع کر کے پاکستان بھیج دیا گیا۔ اور ان کو غیر مسلح کر دیا گیا تاکہ وہ جدوجہد آزادی میں شرکت نہ کر سکیں۔ اس سلسلہ میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس ساری جدوجہد میں آزاد کشمیر کے تمام لیڈران خاموش تماشائی بنے رہے اور سوائے دو افراد سردار ابراہیم خان اور امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی کے اور کسی لیڈر نے مشتاق گرمانی کے سامنے کھڑے ہونے کی جراءت نہ کی۔ 1952ء کو نام نہاد الیکشن میں کرنل شیر احمد خان کو صدر بنایا گیا۔ اور سردار عبدالقیوم خان کو وزیر لیا گیا۔ جن کو چوہدری غلام عباس کی پشت پناہی حاصل تھی۔ اور موصوف کو مشتاق گرمانی کا خاص آدمی کہا جاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ سردار ابراہیم صاحب اور امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی شیر پونچھ کے بارے میں کہانیاں بنا کر حکومت پاکستان سے غلط فہمیاں پیدا کی گئی تاکہ ان دونوں قد آور شخصیات کو راستے سے ہٹایا جا سکے۔ امیر شریعت مولانا عبداللہ صاحب صحت کی خرابی کی وجہ سے زیادہ متحرک نہ رہتے تھے۔ اس لئے ان پر طرح، طرح کے الزامات عائد کئے گئے اور کانگریسی لیڈر تک کہا گیا۔ مگر وہ اس بات پر اٹل رہے کہ کشمیر کا فیصلہ ہوئے بغیر پاکستان کی ہمارے معاملات میں مداخلت کشمیر کی تقسیم کا باعث بنے گی۔ چنانچہ اس الیکشن کے بعد جائنٹ سیکرٹری آف کشمیر آفیسرز کو پورے آزاد کشمیر کا کنٹرول دے دیا گیا۔ جس پر سخت ترین ردعمل ہوا۔ 1955ء میں دوبارہ سخت ترین بغاوت ہوئی، جس سے کچل دیا گیا اور عوامی آواز کو دبا دیا گیا۔ اس سلسلے میں باغ مشتاق گورمانی کی آمد اور جلسہ میں خطاب کے دوران امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی کا یہ فرمان تھا کہ مشتاق گرمانی تم اپنے پاکستان کی فکر کرو۔ ہمیں اکیلا چھوڑ دو۔ ہم صدیوں سے ظالموں کا مقابلہ کرتے آئے ہیں۔ اس لیے ہمیں دھمکیاں دینا چھوڑ دیں۔ اس دوران آزاد کشمیر کی اقتدار کی جنگ کی وجہ سے کافی عرصہ تک پونچھ میں دو لیڈران متبادل قیادت فراہم کرتے رہے۔ سردار قیوم صاحب کی کیونکہ آزاد کشمیر میں اپنی برادری اتنی بڑی نہیں تھی۔ اس لیے ان کے لیے اقتدار کی سیڑھیاں چڑھنے کے لئے جذبوں اور اور منسٹری آف کشمیر آفیسرز کی مکمل تابعداری کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا۔ دوسری طرف پونچھ سے سردار محمد ابراہیم صاحب ایک سکہ بند لیڈر تھے۔ پونچھ سے سدھن قبیلہ کی قربانیاں اس قدر تھی کہ ان کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں تھا۔ موصوف نے اس سلسلے میں مرکزی حکومت کی تابعداری ضرور کی مگر وہ ایک معیاری قانون دان اور با اصول شخص تھے۔ اور اقتدار کے لیے

آنکھیں بند کر کے یس مین بننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ اس لیے پی۔ پی کے دورے حکومت میں بے نظیر بھٹو اوران کے درمیان اختلافات کھل کر سامنے آ گئے تھے۔ دوسری طرف پونچھ سے ہی ممتاز حسین راٹھور ایک اور اہم شخصیت سامنے آئے۔ موصوف بھی راٹھور راجپوت قبیلہ کے لیڈر تھےاا اور حویلی میں جدوجہد آزادی میں ان کے خاندان نے اہم کردار ادا کیا تھا۔ موصوف وزیر اعظم بھی رہے۔ اور اکثر حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ دوسری شخصیات میں غازی کشمیر سردار فتح محمد کریلوی کے فرزند سردار سکندر حیات صاحب اور راجہ حیدر خان آف مظفرآباد چکار کا خاندان شامل ہے۔ سب حضرات حکومت پاکستان کے دباؤ میں آ کر تحریکِ آزادی کے سلسلے میں مثبت کردار ادا نہ کر سکے۔ وجہ صیغہ راز میں شمالی علاقوں کو مرکز کو دینے کا معاہدہ تھا۔ جو آزاد کشمیر کو بیس کیمپ کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار نہ کر سکا۔ اور اس کا شکوہ کے۔ ایچ۔ خورشید اور تحریک آزادی کے دوسرے لیڈران آخری وقت تک کرتے رہے۔ اور جموں کشمیر لبریشن فرنٹ کے چیئرمین امان اللہ خان صاحب جن کا تعلق شمالی علاقوں سے تھا۔ استور گلگت میں پیدا ہوئے۔ اور موصوف نے آخری وقت کراچی معاہدے کے خلاف آواز بلند کی۔ اور گلگت بلتستان کے عوام کے لیے آواز بلند کرتے رہے۔ وہ کشمیری لیڈران میں آزاد کشمیر سے واحد فرد تھے۔ جنہوں نے کسی کے سامنے سر نہیں جھکایا۔ اور مظلوم کشمیریوں کے سامنے آواز بلند کی۔ امان اللہ خان ایک بہترین اور اعلیٰ پایہ کے صحافی تھے۔ اور زندگی کے آخری وقت تک کشمیر کے لیے آواز بلند کرتے رہے۔ تاریخ کشمیر میں ان کی جراءت مندانہ کارکردگی کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ موصوف پاکستان کے حامی تھے اس لئے شیخ عبداللہ سے اختلافات کی وجہ سے پاکستان واپس آ گئے۔ سری نگر میں ان کے خلاف پاکستانی ایجنٹ قرار دے کر مقدمہ چلایا گیا۔ مگر 72-1970 میں موصوف کو انڈین ایجنٹ قرار دے کر گلگت جیل میں ڈال دیا گیا۔ جہاں ان کے بہت سے ساتھی بھی گرفتار ہوئے۔ موصوف نے جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ کے قیام کے بعد مسلح جدوجہد کا آغاز کیا۔ اور مقبول بٹ اور میر احمد مقبوضہ کشمیر میں داخل ہوء مقبول بٹ کی گرفتاری اور سزائے موت کے بعد امان اللہ خان نے پورے کشمیر کی آزادی کی تحریک کا آغاز کیا۔ اور مختلف اداروں کی طرف سے سنگین الزامات کے باوجود کشمیریوں کے حقوق کی جدوجہد میں آزاد کشمیر کے آزاد پیشہ ور لیڈران پر بازی لے گئے۔ اور کرپشن سے دور وقار کے ساتھ کشمیری عوام کی آواز بنے رہے۔ موصوف نے یورپ سمیت بیشتر ممالک میں رہائش بھی اختیار کی۔ اور مسئلہ کشمیر پر مختلف اداروں کے ساتھ روابط بھی برقرار رکھے۔ بائیس سے زیادہ ممالک کے دورے کیے۔ اور اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے اجلاس کے دوران مختلف پریس کانفرنس سے خطاب بھی کیا۔ انٹرویو بھی دیئے۔ موصوف 26 اپریل 2016ء کو 82 سال کی عمر میں راولپنڈی کے ایک ہسپتال میں انتقال کر گئے۔ اور ان کی آخری آرام گاہ بھی گلگت میں ہی ہے۔ جہاں وہ پیدا ہوئے۔ ان کو پورے خطے میں عزت و احترام سے یاد کیا جاتا ہے۔

حریت کانفرنس مقبوضہ جموں وکشمیر

1947ء کے بعد مقبوضہ کشمیر میں شیخ محمد عبداللہ نیشنل کانفرنس کے سربراہ کی حیثیت سے مقبوضہ کشمیر کے واحد لیڈر بن گئے۔ اور مقبوضہ کشمیر دراصل شیخ عبداللہ کے رحم وکرم پر رہ گئے۔ مقبوضہ کشمیر کے دوسرے اہم لیڈر چوہدری غلام عباس پاکستان چلے آئے۔ اور آزادی کی تحریک میں اہم کردار ادا کرنے کا فیصلہ کیا۔ مگر آزاد کشمیر کی حکومت اور گلگت و بلتستان کی تقسیم کے بعد آزاد کشمیر کی وہ حیثیت نہ رہی۔ اور حکومت پاکستان کے سیاسی بحران نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ اور ان مرکزی لیڈران نے تحریک آزادی کے کام

کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کر کے ایسے افراد کو آگے کیا۔ جو ان کے کہنے پر کچھ بھی کرنے کے لئے تیار تھے۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ آزاد کشمیر اقتدار کی جنگ میں شریک ہو گیا۔ مقبوضہ کشمیر میں شیخ عبداللہ مرکز کی سرپرستی میں آگے بڑھا۔ مہاراجہ کی حیثیت ختم کر دی گئی۔ اور اس کو سیاسی میدان میں علیحدہ کر کے جموں کے ڈوگروں کو سیاست میں حصہ دیا گیا۔ اس طرح مرکزی حکومت نے دونوں طرف کے لیڈران کو تسلّی اور تشفّی دی کہ صورتحال بہتر ہونے پر کشمیر کا فیصلہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق ہوگا۔ گو بھارت نے مہاراجہ کے عارضی انڈیا سے الحاق کو ایک بہانہ بنا کر کشمیر کو بھارت کا حصہ قرار دے دیا۔ اور مہاراجہ اور اس کے خاندان کے انکار کے باوجود

انڈیا اپنی ضد پر برقرار رہا۔ اور اس کی کوشش یہی رہی، کہ وہ کشمیر کے قبضہ کو مستقل کرے۔ لداخ کے علاقے کی آبادی زیادہ نہیں تھی۔ اس لیے لداخ اور کارگل کو آہستہ آہستہ کشمیر سے الگ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس دوران مقبوضہ کشمیر میں جماعت اسلامی اور دیگر

تنظیمیں کشمیر کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتی رہیں۔ مگر کوئی خاص مؤثر پلیٹ فارم موجود نہیں تھا۔ آل پارٹنرز حریت کانفرنس کا قیام عمل میں لایا گیا۔ 9 مارچ 1993ء کو کشمیر کے علیحدگی پسندوں اور کشمیر کے مستقبل کے لیے کام کرنے والوں نے محمود احمد ساغر کو کنوئینر بنایا گیا۔ حریت کانفرنس پاکستان کا اور مقبوضہ کشمیر کا چیئرمین میر واعظ عمر فاروق کو بنایا گیا۔ اور 2009ء کو محمود احمد ساغر کو پاکستان کا چیئرمین بنایا گیا۔ اور غلام محمد صفی کو 2010ء میں کنوئینر بنایا گیا۔ آل پارٹیز حریت کانفرنس کی بنیاد 7 اگست 2004ء کو رکھی گئی۔ جس میں سری نگر میں ایک لاکھ افراد جمع ہوئے۔ اس سلسلے میں پبلک کنونشن کے بجائے حریت کانفرنس کی سنٹرل کونسل نے نئی لیڈر

شپ کی بنیاد رکھی اور ان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ پاک بھارت ریاستوں کے قیام کے دوران کشمیر کے عوام کو فیصلہ کرنے کا حق نہیں دیا گیا۔ اور کشمیر کو پاکستان کا حصہ بننا چاہیے۔ آزادی کا نعرہ لگایا گیا اور بھارت کے خلاف منظّم جدوجہد کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

حریت کانفرنس کا نظریہ

حریت کانفرنس کا نظریہ یہ تھا کہ پاکستان کی حمایت کی جائے مگر اقوام متحدہ کی قراردادوں کو سامنے رکھتے ہوئے یہ شرط عائد کی گئی کہ کشمیری عوام کی خواہش کے مطابق مسئلہ کشمیر کا حل سامنے لایا جائے۔ حریت تنظیم کو اسلامی کانفرنس میں آبزرو کی حیثیت دی گئی اور میر واعظ عمر فاروق کو 2005ء میں وزرائے خارجہ کی کانفرنس میں یمن میں نمائندگی دی گئی۔ حُریت کانفرنس میں دو گروپ تھے۔ ایک میر واعظ عمر فاروق گروپ اور دوسرا سید علی شاہ گیلانی گروپ۔ میر واعظ گروپ کو ماڈرن گروپ کا درجہ حاصل تھا۔ یعنی موصوف انڈین حکومت کے ساتھ بھی مذاکرات اور رابطے میں تھے۔ ان میں حریت کانفرنس سے الگ تھلگ یٰسین ملک تھے۔ جو مکمل طور پر خودمختار ریاست کے حامی تھے۔ چنانچہ انڈیا نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اور بعض اطلاعات کے مطابق پاکستان کے بعض اداروں کے ساتھ مل کے سید علی شاہ گیلانی کی پوزیشن کم کرنے پر ان پر دباؤ ڈالا گیا۔ اس سلسلے میں بھارت کا کہنا تھا کہ سید علی شاہ گیلانی مقبوضہ کشمیر میں دہشت گردی پھیلا رہے ہیں۔ گویا کشمیر کے عوام کی آزادی کے لیے ہتھیار اٹھانے والے دہشت گرد ہیں۔ اور فوجی ادارے اگر معصوم بچوں کو بھی گولیوں سے چھلنی کر دیں تو ان کو اس کی اجازت ہے۔ چنانچہ

انڈیا کی کی اجازت سے حرّیت کو تقسیم کر دیا۔ 7 ستمبر 2003ء کو مولانا عباس انصاری نے نئی حریت کانفرنس تشکیل دی۔ جس میں 12 پارٹی کے نمائندوں نے شرکت کی۔ اور سید علی شاہ گیلانی نے انصاری کو حریت کانفرنس سے نکال دیا۔ اس سلسلے میں حریت کانفرنس مسّرت عالم جو عارضی اور سید علی شاہ گیلانی کے ساتھ تفصیلی ملاقات میں انصاری کو نکال باہر کیا۔ اور سید علی شاہ گیلانی نے اپنی حرّیت کانفرنس کا احیاء کر دیا۔ اور یوں سید علی شاہ گیلانی کا گروپ ایک طاقتور گروپ کی صورت میں سامنے آ گیا جس کے ساتھ مجاہدین کا گروپ بھی شامل تھا۔ اس کے بعد میر واعظ کو دوبارہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ جب سید شبیر شاہ اور نعیم خان اور شیعہ لیڈر آغا حسین نے سید علی شاہ گیلانی کے ساتھ ملنے کا فیصلہ کیا۔ تقریباً اہم سارے ہی لیڈر اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلے کا حل چاہتے ہیں۔ نامور شخصیات کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔ جنہوں نے اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق مسئلہ کا حل نکالنے کی ضرورت پر زور دیا۔

1۔ عبدالغنی لون

2۔ سید علی شاہ گیلانی

3۔ میر واعظ عمر فاروق

4۔ مختار احمد ورا

5۔ عبدالغنی بھٹ

6۔ عباس انصاری

7۔ یٰسین ملک

8۔ نعیم احمد خان

ان سب کا تعلق مختلف تنظیموں سے تھا۔ اور ان سب کا ایک متفقہ فارمولا پر اتفاق تھا کہ اقوام متحدہ کی قراردادوں پر عملدر آمد ہونا چاہیے۔

سیاسی خاندان کے بارے میں اطلاعات اور ان کے بیرون ملک روابط

یہ بات تو نوٹ کرنے کے قابل ہے کہ حرّیت لیڈر مجاہدین آزادی کی جدوجہد کے حامی تھے۔ اور ہزاروں نوجوان آزاد کشمیر اور پاکستان سے جدوجہد آزادی کے لیے گئے اپنی جانیں قربان کیں۔ مگر ان سیاسی خاندانوں کی اولادیں آرام سے دیار غیر یا بھارت کے اندر باقاعدہ کام کرتے رہے۔ اور ان کو ہر طرح کا تحفظ فراہم کیا گیا۔ مگر دوسری طرف بے گناہ شہریوں کو مرواتے رہے۔ جس کے بارے میں تفصیلات کچھ یوں ہیں۔ حریت لیڈر سید علی شاہ گیلانی کے بڑے بیٹے نعیم گیلانی اور ان کی اہلیہ میڈیکل کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دوسرے بیٹے ظہور گیلانی اپنی اہلیہ کے ہمراہ نیویارک میں رہتے ہیں۔ اظہر گیلانی ان کے پوتے انڈین ایئر لائن میں کام کرتے ہیں۔ اور ان کی بیٹی فرحت گیلانی جدہ میں استاد ہیں۔ اور ان کے خاوند انجینئر ہیں۔ آسیہ اندرابی کے بڑے بیٹے محمد بن قاسم اور ان کی بہن ملائیشیا میں رہتے ہیں۔ اور ان کے تقریباً تمام رشتے دار پاکستان، برطانیہ اور سعودیہ عربیہ میں ہیں۔ ایک بھتیجہ پاکستان آرمی میں کیپٹن ہے اور دوسرے بھتیجے مجھے ارتیاز این نبی (Nabi-Un-Irtiyaz) انجینئر ہیں۔ اور انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد میں پروفیسر ہیں۔ اور اکثر ان تمام لیڈران کا تعلق آئی

ایس۔ آئی سے بتاتے رہے ہیں۔ کہ وہ ان کے سرمایہ پر تشدد پھیلاتے ہیں۔ اور دولت کی خاطر بچوں کو مرواتے ہیں۔ نہ ہی وہ کشمیر کا حل چاہتے ہیں۔ اور نہ ہی ان کی کوئی پالیسی ہے۔ چنانچہ سب سے بڑا اہم اور غلط فیصلہ حریت کانفرنس نے 2014ء میں کیا۔ جب الیکشن کا بائیکاٹ کیا اور اس بائیکاٹ کی وجہ سے کشمیری عوام نے سخت ردعمل کا اظہار کیا اور بائیکاٹ کے باوجود لوگوں یعنی ۶۵ فیصد لوگوں نے اس الیکشن میں حصہ لے کر حریت کانفرنس کی عوامی حمایت سے پردہ ہٹا دیا۔ وجہ یہ تھی کہ لوگ چاہتے تھے کہ وہ اسمبلی میں جائیں۔ اور قانونی جنگ لڑیں۔ اور کشمیریوں کے مفادات کی ترجمانی کریں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسمبلی الیکشن کے لیے بھارت، نواز جماعتوں کو کھلی چھٹی دے دی گئی۔ بعض صحافیوں کا کہنا تھا کہ یہ لوگ تنخواہیں باہر سے وصول کرتے ہیں۔ اور لوگوں کو مرواتے ہیں۔ ان کے روابط دونوں حکومتوں کے ساتھ ہیں۔ چنانچہ اس کا ثبوت یہ تھا کہ میر واعظ عمر فاروق انڈیا سے بھی قریبی روابط رکھتے تھے۔ ان کو بیرونِ ملک سفر کی اجازت کے ساتھ، ساتھ سرکاری اخراجات بھی حکومت ہند فراہم کرتی تھی۔ اور ان کے ساتھ باقاعدہ حکومتی نمائندے آتے تھے۔ جو حکومت کے ایجنٹ ہوتے تھے۔ تو دوسری طرف پاکستان سے بھی ان کو امداد ملتی تھی۔ اس سلسلے میں 1993ء کے دورانیہ میں راقم جب لندن کے دورے پر گیا۔ اور برطانیہ میں کئی پروگراموں اور جلسوں میں شرکت کی تو مجھے یاد ہے کہ مقبوضہ کشمیر کے اہم رہنما اور ماسٹر کشمیر فریڈم موومنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر ایوب ٹھاکر مرحوم نے سعودی عرب میں ایک پروگرام کے بارے میں بتایا کہ دن کو ان کا پروگرام ہمارے ساتھ تھا۔ تو رات کا استقبالیہ انڈین سفیر کی رہائشگاہ پر تھا۔ جس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ ساری رپورٹ ان صاحبان کو ہمارے بارے میں فراہم کرتے تھے۔ یہ صورتحال تھی۔ فیصلہ کن جدوجہد کے دوران ہمارے کشمیری لیڈران کی۔ جو کشمیر کے نام پر قربانیاں تو مانگتے تھے۔ مگر خود کشمیر کے نام پر تجارت کرتے تھے۔

مقبوضہ کشمیر میں انڈین لابی کے لیے کام کرنے والوں کی کمی نہ تھی۔ اتنی بڑی فوج کی موجودگی میں فوجی دہشت گردی کی وجہ سے بہت سے خاندان اپنی جانوں کی حفاظت کے لیے درمیانی راستہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیے گئے۔ وادی میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ اور یہاں کے لیڈران کو پورے کشمیر پر دسترس حاصل تھی۔ مگر انڈیا کے حامی لیڈران نے تو اپنے اقتدار کی طرف توجہ دی۔ اور آزاد پسند لیڈران نے الیکشن لڑنے کی بجائے ڈیڑھ انچ کی مساجد بنالیں۔ اور اپنی سیاست شروع کر دی۔ اور 25 کے لگ بھگ سیاسی لیڈران اور تنظیموں کو انڈین لابی تقسیم پر تقسیم کرتی گئی۔ اور پھر ان پر اس قدر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اپنے، اپنے علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئے۔ اور یوں یہ لوگ اپنے قد کاٹھ کے لئے لڑنے لگے۔ ان لیڈران نے دوسرے کشمیری باشندوں تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔ دیار غیر میں رہتے ہوئے راقم نے وادی کے پنڈتوں سمیت ڈوگرہ خاندانوں کے ساتھ بھی بات چیت کی۔ ان میں سے چند اہم شخصیات غیر ملکی دوروں پر رہتے تھے۔ یہ لوگ انڈیا کے وفادار تھے۔ اس لیے ان کی دوروں میں خاصی حوصلہ افزائی کی جاتی تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ریاست کشمیر کے اکیلے مسلمان ہی مالک نہیں ہیں۔ ہم بھی ہیں۔ اس لیے اگر آپ ہمارے حقوق کی بات نہیں کریں گئے اور ہمیں اپنے ساتھ ملانے کا راستہ تلاش نہیں کریں گے۔ تو ہمیں بھی کسی کے ساتھ ملنا ہوگا اور اس سلسلے میں ہمیں اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ راجہ صاحب، مہاراجہ ہری سنگھ نے انڈیا کے ساتھ الحاق نہیں کیا تھا۔ اس کو الحاق کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ وہ مسلمانوں کے ساتھ مل کر ایک ایسی ریاست بنانے کا قائل تھا۔ جہاں اس کی ذاتی مہاراجہ کی حیثیت

بحال رہے۔اور دوسری طرف ملک کا وزیراعظم مسلمان ہو۔گویا وہ ایسا نظام لانے کا خواہشمند تھا۔جہاں اس کی خاندانی حیثیت اور اس کے ساتھ وابستہ ہندو طبقہ اس کا ساتھ دے۔اور سب مل کر ایک دوسرے کو تحفظ فراہم کرنے کا وعدہ کریں۔قائد اعظم محمد علی جناح اس صورتحال کا ادراک کر چکے تھے۔مگر ان کی باتوں پر اور ان کے مہاراجہ سے وعدہ پر عملدر آمد نہ ہونے دیا گیا اور یوں آزاد علاقہ سے 1947ء میں ہندو آبادی کا صفایا کر دیا گیا۔یا ان کو اپنے وطن سے دربدر کر دیا گیا۔اور اس کا فائدہ ہندوستان کی سیاسی قیادت نے اٹھایا۔اور یوں سانحہِ جموں نے تقسیم کشمیر کی بنیاد فراہم کر دی۔پھر ہندوستان کی حکومت نے گذشتہ 73 سالوں میں وادی کو قید خانہ بنا دیا۔اور وادی کی حریت لیڈر شپ نے پاکستان اور خودمختار کی تقسیم کا سلسلہ شروع کر دیا۔اور جموں اور لداخ کو مکمل طور پر بھول گئے۔لداخ ایک ایسا علاقہ تھا۔جہاں بدھ مت اور مسلمان دونوں کا تناسب برابری کی حد تک تھا۔اور رقبہ زیادہ ہونے کے باوجود آبادی بہت کم تھی۔اس لیے ممبرانِ کشیر اسمبلی میں اہم کردار ادا کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔چناچہ زیادہ تر سرینگر ساری ریاست کا محور و مرکز رہا۔اور بھارت نواز لیڈر بھی ایک اتحادی پروگرام مرتب کرنے میں ناکام رہے۔جبکہ حریت لیڈران یہ بات جاننے سے قاصر رہے کہ جب تک وہ سب گروپوں کو ساتھ لے کر نہیں چلیں گے۔اس وقت تک بھارت اور پاکستان دونوں ملک ان کو انگلیوں پر نچاتے رہیں گے۔سید علی شاہ گیلانی، میر واعظ عمر فاروق، یسین ملک صاحب اپنا اپنا راگ الاپتے رہے۔دوسری طرف انڈیا اور پاکستان کے لیڈران اندرون خانہ ان لیڈران کو تقسیم کرتے رہے۔مجھے یاد ہے کہ جب حریت کانفرنس کی تقسیم کا معاملہ سامنے آیا تو اس وقت حکومت پاکستان کو بحرانی دور سے گزرنا پڑ رہا تھا۔مشاہد حسین سیّد کے بھارتی رہنماؤں کے ساتھ بہتر روابط تھے۔اس سلسلے میں حریت کانفرنس کو تقسیم کرنے کے لیے ان حضرات کے ذریعے عمر فاروق کو سامنے لایا گیا۔اطلاعات کے مطابق ہندوستان اور پاکستان کی حکومتوں کے درمیان اس بات پر معاہدہ ہو گیا تھا کہ سید علی شاہ گیلانی کی طاقت کو کمزور کیا جائے اور ایک متوازن اور درمیانی درجے کی لیڈر شپ لائی جائے اور عمر فاروق اس سلسلے میں ہندوستان کی مرکزی حکومت کے لیے قابل قبول تھے۔چنانچہ اطلاعات کے مطابق موصوف اور آزاد کشمیر کے ایک سیاستدان نے اس تقسیم کے عمل میں اہم کردار ادا کیا۔بدقسمتی سے پاکستان میں سول حکومت ہمیشہ انتہائی کمزور رہی ہے۔اس لئے بھارت ہمیشہ ان حکومتوں کو امریکہ کے ذریعے اپنے مفادات کے لیے اقدامات کرنے پر مجبور کرتا رہا۔ایک طرف نوجوانوں کو بھارت کے خلاف بغاوت کے لیے تیار کیا جاتا تو دوسری طرف مقبوضہ کشمیر کے لیڈران میں اختلافات پیدا کرنے کے لیے امریکہ کے دباؤ میں آ کر بھارت کے لیے نرم رویہ رکھنے والے لیڈران کو آگے کیا جاتا۔یہی کام میاں نواز شریف کے دور میں ہوتا رہا اور جنرل پرویز مشرف کے دور میں بھی حکومتِ پاکستان دباؤ کا شکار رہی۔اس سلسلے میں مجھے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔جب میر واعظ عمر فاروق کو نیویارک میں آمد اور ان کے ہمراہ ایک صحافی کی مانٹریال میں آمد اور انڈین لابی کی طرف سے دیئے گئے استقبالیہ پروگرام میں خطاب کے دوران ان کے یہ انکشافات کہ بیرونِ ملک دورے کرنے والے مقبوضہ کشمیر کے لیڈران کو ان دوروں میں انڈین پالیسی کے مطابق اقدامات کرنے ہوتے ہیں۔اور ان کے ساتھ اکثر انڈین گورنمنٹ کا نمائندہ موجود ہوتا ہے۔جو ان کو لائن میں رکھتا ہے۔اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں کو بیرونِ ملک دوروں کی اجازت دی جاتی ہے۔وہ آزادانہ خیالات کا اظہار کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوتے۔اور واپسی پر حکومت ہند کو سرگرمیوں کی ساری

رپورٹ فراہم کی جاتی ہے تاکہ انڈین لابی آئندہ ان افراد پر نظر رکھ سکے۔جو دیارِ غیر میں کشمیر کے بارے میں آواز بلند کرتے رہتے ہیں۔بدقسمتی سے پاکستان کی کمزور حکومتوں کی وجہ سے بھارت اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔یہ مسلم صحافی ہندوستان سے موصوف کے ساتھ آئے تھے گویا موصوف سرکاری نمائندہ تھے۔جو موصوف کے دورے کے بارے میں رپورٹ فراہم کر رہے تھے اور اس بات کا اکثر پاکستانی سفارتکاروں کو بھی علم تھا۔گویا یہ سب پروگرام دونوں حکومتوں کی رضامندی سے ہو رہا تھا۔چنانچہ پاکستان کے کمزور سیاستدان اور غیر قانونی طور پر مداخلت کر کے حکومت پر قبضہ کرنے والے جنرل حضرات اپنے آئینی حیثیت بحال رکھنے اور دنیا کے سامنے اپنی پوزیشن بنانے کے لئے بھارت کے دباؤ میں آ کر اکثر کشمیر کی جدوجہد آزادی کو نقصان پہنچاتے رہے۔اور اس سلسلے میں آزاد کشمیر کے حکمران ان فوجی جرنیلوں کی معاونت کرتے رہے اور نعرہ بازی کرتے رہے تاکہ کشمیر کے نام پر ان کی عوام میں پوزیشن کو بہتر بنایا جا سکے۔یہ سلسلہ خوب چلا۔اس میں آزاد کشمیر میں بعض لیڈران جن میں سردار عبدالقیوم خان مرحوم، ان کے فرزند سردار عتیق احمد خان، بیرسٹر سلطان محمود خان ارب پتی بن گئے۔ان لیڈران کی سرپرستی میں یہ لوگ اپنے فنڈز پر بھی ہاتھ صاف کر گئے۔

بھارت کا نیا ہٹلر نریندر مودی اور کشمیر پر اس کا آخری وار

انڈیا میں ہندو انتہا پسند تنظیمیں ایک عرصہ سے کام کر رہی تھیں۔مگر وہ الیکشن لڑنے کی پوزیشن میں نہ تھیں۔مگر ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انڈیا میں ان انتہا پسندوں کو عالمی تنظیموں کی طرف سے مالی امداد کا سلسلہ چل نکلا۔وجہ یہ تھی کہ انڈیا کو مسلمانوں کے خلاف کیمپ میں لایا جائے۔اور اس سلسلے میں ہندو انتہا پسندوں کو آگے کیا گیا۔بی۔جے۔پی کی پہلی حکومت میں اس سلسلے میں منصوبہ بندی کی گئی اور ایک تاریخی بابری مسجد کو رام مندر بنانے کے لیے اس کو گرانے کا پروگرام ترتیب دیا گیا۔جس میں ایک ہزار سے زیادہ مسلمانوں کو قتل کیا گیا اور یوں پورے ہندوستان میں سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت ہندو انتہا پسندوں کو لیڈر شپ فراہم کر دی گئی۔سپریم کورٹ کے حکم کے باوجود بھارتی جنتا پارٹی کے لیڈر ایل۔کے۔ایڈوانی نے مظاہروں کا سلسلہ جاری رکھا۔اور حکم عدولی کی۔مگر کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکا۔چناچہ 1998ء میں بی۔جے۔پی کی شہرت کو مزید آگے بڑھانے اور پارلیمنٹ میں زیادہ سیٹیں حاصل کرنے کے لئے اس کے قائدین نے عارضی طور پر بابری مسجد پر رام مندر کی تعمیر کو روک دیا۔۲۰۰۲ء کا گجرات میں قتل عام نریندر مودی کی سرپرستی میں کروایا گیا۔جب ٹرین کے ایک حادثے میں 65 افراد کی جل کر موت ہو گئی۔تو الزام مسلمانوں پر ڈال دیا گیا اور گجرات کے امیر ترین مسلمانوں کی جائیدادوں، کارخانوں اور عمارات کو نشانہ بنایا گیا اور مختلف تنظیموں کے اعلیٰ افراد سمیت کئی ہزار مسلمانوں کو زندہ جلا دیا گیا۔ایک لاکھ پچاس ہزار سے زیادہ مسلمان بے گھر کر دیئے گئے اور ان گھیراؤ اور جلاؤ کے دوران ایک فرد کو بھی گرفتار نہیں کیا گیا۔بعدازاں جب 2005ء کو تحقیقات کی گئی۔تو پتہ چلا کہ ٹرین میں گیس کا چولہا پھٹنے سے آگ لگی۔چنانچہ اس سلسلے میں سینکڑوں افراد کو گرفتار کیا گیا۔مگر اطلاعات کے مطابق اس سازش کے پس پردہ نریندر مودی سمیت درجن بھر آر۔ایس۔ایس کے لیڈران کا نام تک نہیں آنے دیا۔اس کے خلاف عالمی ردعمل سامنے آیا۔بہت سے ممالک نے نریندر مودی کو ویزا دینے سے انکار کیا اور سفر پر پابندی عائد کر دی گئی گی۔انسانی حقوق کے اداروں نے موصوف کے خلاف عالمی

فوجداری عدالت میں مقدمہ دائر کرنے کی درخواست دی۔مگر مودی پر دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ وجہ یہ تھی کہ مودی کے خلیجی ریاستوں اور سعودی عرب سے تجارتی تعلقات تھے۔اور وزارت اعلیٰ کے دوران اس نے کئی بلین ڈالر کی سرمایہ کاری ان ریاستوں سے کروائی تھی۔ اس لیے طاقتور اور امیر مسلمان ریاستیں خاموش ہوگئی۔ جبکہ پاکستان کی قیادت اس موقع سے فائدہ نہ اٹھا سکی۔ اور یوں مودی ایک جنگی مجرم ہونے کے باوجود انڈیا میں ہندو انتہا پسند پارٹیوں کا ہیرو بن گیا۔اور جلد ہی وہ بھارتی جنتا پارٹی کا لیڈر بن کر وزارت اعظمیٰ کی تیاری کرنے لگا۔اس سلسلے میں پہلی دفعہ 2014ء مئی 26 کو مودی نے وزارت عظمیٰ کا چارج سنبھالا۔ دنیا حیرت سے دیکھتی رہی۔اس طوفان کی آمد کا کسی کو علم نہیں تھا۔ پاکستان اور کشمیر کی لیڈر خواب خرگوش میں سوئے رہے اور مودی جو آر۔ ایس۔ایس کا بچپن سے کارکن تھا۔اب دنیا کی سب سے بڑی آبادی والے ملک کا وزیر اعظم بن چکا تھا۔ گو مودی کو اکثریت حاصل نہیں تھی۔مگر اتحادی جماعتوں کے ساتھ مل کر اس نے حکومت بنائی۔ چنانچہ اس دوران مودی نے آئندہ اکثریت حاصل کرنے کے لیے ایک منصوبہ بندی سے کام کیا۔اور ہندو انتہا پسند جماعتوں کی مدد سے اس دوران اس نے ایک منصوبہ بندی کے تحت کشمیر کی ریاست کو انڈیا میں ضم کرنے اور مسلمانوں کو سیکنڈ کلاس شہری بنانے کا منصوبہ بنایا۔ یہ وہ دور تھا۔ جب مقبوضہ کشمیر میں بدترین دہشت گردی کی گئی اور یہاں تک کے بچوں تک کو معاف نہیں کیا گیا۔ پانچ ہزار سے زیادہ بچے پیلٹ گن کی گولیوں کا نشانہ بنے اور ان کی آنکھوں کی بینائی ضائع ہوگئی۔ مسئلہ عالمی دنیا تک پہنچا۔مگر اسلامی دنیا کی بے رخی اور پاکستان کی قیادت کی کمزور پالیسیوں کی وجہ سے صورتحال کو بہتر نہ کیا جا سکا۔مقبوضہ کشمیر کی انڈین پالیسیوں کا ساتھ دینے والی سیاسی جماعتیں خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی رہی۔ جبکہ حریت قیادت سنگین صورتحال کا ادراک نہ کر سکی اور کشمیر کے دوسرے علاقوں کی سیاسی قوتوں کے ساتھ ان کا رابطہ نہ ہونے کے برابر تھا۔جموں کے ڈوگرے اور لداخ کے بدھ مت کے پیروکار اور وادی کے مسلمان الگ تھلگ اپنی ریاستوں پر رواں دواں تھے۔اور دہلی سرکار ایک منصوبہ بندی کے تحت تقسیم کشمیر اور مقبوضہ کشمیر کو آہستہ،آہستہ بھارت میں ضم کرنے کے لئے منصوبہ بندی بنا رہی تھی۔ دوسری طرف سے سیز فائر لائن پر بھارتی حملوں کا ایک سلسلہ جاری تھا۔ بھارت آئے روز پاکستان پر الزام عائد کر کے سرحدی علاقوں میں سویلین آبادیوں کو نشانہ بناتا رہا۔ گھروں پر گولا بارود پھینکنے کا سلسلہ جاری رہا۔شہری مرتے رہے مگر بھارت کے ان جرائم کے بارے میں عالمی اداروں تک پاکستان کی رسائی نہ ہوئی۔ نہ ہی اس سلسلے میں کوششیں کی گئیں۔آزاد کشمیر کی لیڈر شپ کا تو یہ حال تھا کہ آزاد کشمیر کے سابق وزیر اعظم سردار عتیق احمد خان نے پہلی دفعہ مودی کی کامیابی پر کہا! کہ مودی شیر کا بچہ ہے۔ کامیاب ہو کر مسئلہ کشمیر پر بات چیت کرے گا۔اس سے آپ ہمارے کشمیری لیڈران کی حالت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مودی نے سیاست میں قدم جمانے کے لیے ایک طرف کشمیر میں ظلم و جبر کا سلسلہ جاری رکھا تو دوسری طرف پاکستان کی حکومت کے ساتھ بھی دوستی کا ہاتھ بڑھاتا رہا۔ اسے آئندہ الیکشن میں پارلیمنٹ میں مکمل بالادستی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ اس نے اشارے دینے شروع کر دیے کہ کشمیر کی خصوصی حیثیت کو ختم کر دیا جائے گا اور بی۔ جے۔ پی کی حکومت کشمیر کی خصوصی حیثیت اور آرٹیکل 370 اور 35A کو آئندہ الیکشن میں اکثریت کے بعد ختم کر دی گئی۔ اور کشمیر کو بھارتی صوبے کا درجہ دے گی۔اس سلسلے میں اس سنگین صورتحال کے بارے میں بھارت نواز اور آزادیِ پسند تنظیموں میں سے کوئی بھی صورتحال کا صحیح طریقے سے ادراک نہ کر سکا۔ دوسری طرف

نریندر مودی نے جموں میں اپنی جماعت کو مضبوط بنانے کے لیے اقدامات کیے۔اور لداخ کی کونسل کو زیادہ اختیارات دے کر ان کو آگے کیا گیا کہ لداخ کے لوگوں کی کشمیر کی مرکزی حکومت استحصال کر رہی ہے۔اور وقت آ گیا ہے لداخ کے عوام اپنی بہتری کے لیے اقدامات کریں۔ چنانچہ لداخ کی بدھ مت آبادی لیہ کے لوگوں کو ایک سوچی سمجھی منصوبہ بندی کے تحت آگے کیا گیا تھا کہ ان علاقوں کو مرکز کے تحت کر دیا جائے۔ یہ کام انتہائی منصوبہ بندی کے ساتھ کیا گیا۔اس سلسلے میں کشمیر کی حکومت تو پہلے ہی بھارت کے اشاروں پر ناچتی تھی۔اس لئے ان کو تو اپنی کرسی سے غرض تھی۔اس لئے ان کو اس مسئلے پر زیادہ بات چیت کی ضرورت نہیں تھی۔ کیونکہ لداخ کے علاقے محدود آبادی والے علاقے تھے۔جن کی اسمبلی میں کوئی طاقت نہیں تھی۔اس لیے اس سلسلے میں حریت کانفرنس کے اراکین اور نمائندوں نے اس اہم بھارتی سازش کے بارے میں جاننے کی نہ کوششیں کی اور نہ ہی آئندہ خطرناک صورتحال کے بارے میں کشمیر کے دوسرے لیڈران سے روابط قائم کئے گئے۔

مودی کے لئے بہترین موقع۔ماہرین کے مطابق یہ دھماکہ "را" نے کروایا

وزیر اعظم نریندر مودی ایک منصوبے کے تحت آگے بڑھ رہا تھا۔اور ہر معاملے میں الزامات پاکستان پر لگاتا تھا۔ چنانچہ کشمیر میں ہونے والے بیشتر تصادم کو جیش محمد سے تعبیر کیا گیا۔اور بھارتی افواج کے ہاتھوں مارے جانے والے نوجوان نہ ہی کسی تنظیم کے ممبر تھے اور نہ ہی ان کا اس جنگی مہم سے کوئی کردار تھا۔ یہ نوجوان صرف پروپیگنڈہ کے لیے نشانہ بنائے جاتے تھے۔اسی قسم کا ایک حملہ پٹھانکوٹ ایئر بیس پر بھی ہوا۔جس کی تحقیقات کا جب مطالبہ کیا گیا تو بھارت نے تعاون کرنے سے انکار کر دیا۔مودی ایک منصوبہ بندی سے پاکستان کو بدنام کرنے اور کشمیری باشندوں کو دہشت گرد قرار دینے کے لیے ایک نیا پلان بنا رہا تھا۔اس کا مقصد کشمیر کو بھارت میں ضم کرنا اور عالمی سطح پر پاکستان اور تحریکِ آزادی کے رہنماؤں کو دہشت گرد قرار دے کر عالمی سطح پر بدنام کرنا تھا۔ چنانچہ مودی نے پاکستان کے ساتھ تصادم کی ابتدا اسی سازش سے کی اور 11 فروری 2019ء کو جموں سرینگر شاہراہ پر لیتھ پورہ (leth pora) پلوامہ ڈسٹرک سے گزرتے ہوئے ملٹری کانوائے پر خودکش حملہ ہوا۔جس میں ایک کار میں سوار افراد نے اس کار کو دھماکہ سے اڑا دیا اور خود بھی اس کی نظر ہو گئے۔اس حملے میں 40 فوجی مارے گئے بے شمار ملٹری گاڑیاں تباہ ہوئیں۔اور بے شمار افراد زخمی ہوئے اور اس کا الزام جیش محمد پر لگایا گیا۔اس حملے میں عدیل احمد ڈار نامی نوجوان کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ جو پلوامہ ڈسٹرک کا رہنے والا تھا اور اس کی عمر ۲۲ سال تھی۔اس کو کئی بار گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور گزشتہ کچھ ماہ سے وہ گھر واپس نہیں گیا۔اس کے والدین کا کہنا تھا کہ اسے گرفتار کر کے کئی بار لے جایا گیا اور پھر اسے رہا کر دیا جاتا۔ وہ حد سے زیادہ پریشان رہتا تھا۔ اور اس کے بارے میں انہیں علم نہیں تھا کہ وہ کسی تنظیم کے ساتھ کام کرتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ اس کار سے کسی بھی شخص کی شناخت نہ ہو سکی۔ بعد ازاں ڈی۔این۔اے ٹیسٹ کو بہانہ بنا کر اعلان کر دیا گیا کہ یہ اس نوجوان کا ڈی۔این۔اے ہے۔مگر جب پاکستان نے تحقیقات میں شامل ہونے کی خواہش ظاہر کی تو انکار کر دیا گیا۔فوجی ماہرین کے مطابق اتنی بڑی مقدار میں خطرناک دھماکہ خیز مواد پاکستان سے لانا ممکن نہیں ہے۔اور نہ ہی مقامی مارکیٹ سے ایسا خطرناک مواد حاصل کیا جا سکتا ہے۔ گویا یہ کام اندرونی سطح پر کیا گیا اور عدیل احمد ڈار کو غائب کر کے اس کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا۔ ظاہر ہے یہ نوجوان ان کی

حراست میں بعدازاں قتل کردیا گیا ہوگا۔ گویا یہ سب اقدامات ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیے گے۔اور 2016ء میں پٹھانکوٹ حملہ بھی ایجنسیوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا۔مگر نہ ہی پاکستانی لیڈرشپ اور نہ ہی کشمیری لیڈرشپ اس کا ادراک کرسکی۔ کیونکہ دونوں اپنی سازشوں میں مصروف تھے۔ اور ایک دوسرے پر الزامات اور احتساب کے نعروں میں ملوّث تھے۔وہ یہ بھول گئے تھے کہ مودی کیا کھیلنے والا ہے۔مودی نے اپنی منصوبہ بندی کے تحت انتہا پسند ہندوؤں کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنا راستہ صاف کردیا تھا۔اور مزید جذبات بھڑکانے کے لیے پاکستان میں بالاکوٹ پر حملہ کیا اور ایک جہاز بھی مار گرایا اور اس کا ایک پائلٹ بھی گرفتار ہوا۔ پاکستان کا کوئی جانی نقصان نہیں ہوا۔ یہ مودی کا ایک شو تھا۔جو بھارتی انتہاپسندوں کے جذبات سے کھیلنے کا نادر موقع تھا اور وہ اس میں کامیاب ہوگیا۔کیونکہ اس نے پہلے ہندوانتہاپسندوں سے وعدہ کیا تھا کہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کروں گا اور مسلمانوں کو پناہ دینے پر پابندی لگائی جائے گی اور مسلمانوں کو شہری ہونے کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا۔اس سلسلے میں بھارتی مسلمان قیادت، پاکستان کی سیاسی قیادت اور کشمیری قیادت تینوں مودی کے منصوبوں کو سمجھنے میں ناکام رہے اور اس کا خمیازہ کشمیری بھگت رہے ہیں اور پاکستان بھی بھگتے گا۔

انڈیا کی طرف سے کشمیر کی ریاست کو ضم کرنے کا فیصلہ اور کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرنے کے لیے آئینی تبدیلی

وزیراعظم نریندر مودی کی طرف سے 5 اگست 2019ء کے جموں وکشمیر کی ریاست کی خصوصی حیثیت کو ختم کرنے کا فیصلہ اور آرٹیکل 370 کو ختم کر کے ریاست کو صوبائی حیثیت دینے اور لداخ کے حصّے کو براہ راست مرکزی انتظام میں لانے کے اقدامات کو ساری دنیا نے اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل کی قراردادوں کی خلاف ورزی اور بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی قرار دیا۔اور اس سلسلے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ اقدام مکمل طور پر بین الاقوامی قوانین کی خلاف ورزی تھا۔ اس اقدام کا مقصد ریاست کشمیر کی حیثیت کو عالمی سطح سے ختم کر کے اس کو انڈیا، پاکستان سرحدی تنازعہ بنانا تھا۔مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ یہ ریاست ایک متنازعہ ریاست ہے اور عالمی سطح پر اس کی متنازعہ حیثیت کے بارے میں کسی کی صورت میں دو آرائیں ہوسکتیں اور انڈیا کی غلط ذہنی روش دونوں ملکوں کے ساتھ، ساتھ عالمی اداروں کو بھی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اور ایک سال سے پورا کشمیر مکمل لاک ڈاون کا شکار ہے۔

پاک وہند تقسیم کے وقت آرٹیکل 2(4) آزادی ہندا یکٹ کے تحت اہم ریاستوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ پاکستان یا ہندوستان میں سے کسی ایک سے الحاق کرلیں یا الگ آزاد ریاست کی حیثیت سے رہیں۔ بہت سی ریاستوں کے لئے ان کی جغرافیائی یا مذہبی حیثیت کی وجہ سے دونوں میں سے ایک ریاست کا انتخاب آسان تھا۔مگر ریاست جموں وکشمیر کی پیچیدہ صورتحال کی وجہ سے یہ علاقہ اس وقت دو ریاستوں کے درمیان ایٹمی جنگ کے خطرات سے دوچار ہوگیا ہے۔ بلکہ انڈیا کی طرف سے یکطرفہ کشمیر کی ریاست کو تقسیم کر کے ضم کرنے کی وجہ سے چین بھی اب اس دوڑ میں شامل ہوگیا ہے۔اور لداخ کو تبت کا حصہ قرار دیتے ہوئے انڈیا کی طرف سے اس کو اپنا حصہ قرار دینے پر دونوں ملکوں کے درمیان خونریز تصادم کا سلسلہ بھی چل نکلا۔

اس سلسلے میں ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ ہری سنگھ نے اس ریاست کو خودمختار رکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم نے اس کے ساتھ معاہدہ کرلیا کہ پاکستان ان کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گا اور کشمیر کے مہاراجہ کو اجازت دے دی کہ وہ باہمی مشاورت سے کوئی حل نکالے۔ چنانچہ قائداعظم اور مہاراجہ کے درمیان (Stand stil) معاہدہ قائداعظم محمد علی جناح کی امن پسندی اور کشمیری عوام کے حقوق کے بارے میں ایک انتہائی اہم فیصلہ تھا۔مگر انڈین لیڈران جواہر لال نہرو اور پٹیل نے مہاراجہ کو اس قدر مجبور کردیا کہ مہاراجہ کے لیے انڈین ریاست کے ساتھ شامل ہونے کے علاوہ کوئی چارہ کار بھی نہ رہا تھا۔ چنانچہ مہاراجہ ہری سنگھ کی سخت ترین شرائط کے بعد انڈین حکومت نے معاہدے پر دستخط کرنے کے بعد اسی معاہدہ میں اپنی طرف سے شرائط میں اضافہ کردیا۔ حالانکہ مہاراجہ ہری سنگھ کی خواہش تھی کہ اس مسئلہ پر بھارت اور پاکستان دونوں کشمیریوں کو فیصلہ کرنے کے لئے وقت دیں۔ چنانچہ ۲۷ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں گورنر جنرل نے انڈیا کے ساتھ الحاق کی دستاویزات کی منظوری دے دی۔مگر ساتھ ہی یہ شرط بھی رکھی کہ جب کشمیر کی صورتحال بہتر ہوجائے گی تو اس الحاق کا فیصلہ کشمیری عوام کی رائے سے طے کیا جائے گا۔ گویا یہ عارضی الحاق تھا۔ جو بھارت کے زبردست دباؤ پر کیا گیا تھا اور اس میں بعض شرائط مہاراجہ کی رضامندی کے بغیر لکھ دی گئی تھیں۔ جس کا مہاراجہ کو علم ہی نہ تھا۔ چنانچہ مہاراجہ کا یہ معاہدہ انڈیا کی حکومت دنیا کے سامنے لانے میں ناکام رہی کیونکہ اس میں مہاراجہ کی رضامندی شامل نہیں تھی۔ چنانچہ مہاراجہ کے ساتھ رضامندی کے بغیر کسی بھی قسم کا معاہدہ حکومت ہند کو اختیار نہیں دیتا تھا۔ چنانچہ ریاست کے حکمران کی رضامندی کے بغیر شق نمبر 5 میں الحاق غیرقانونی تھا۔ پھر اس دستاویز میں کوئی ایسی تجویز نہیں تھی۔ جس میں مہاراجہ نے انڈیا کے لئے آئین کو قبول کرنے پر رضامندی ظاہر کی ہے۔ اور پھر اس میں مہاراجہ کی ریاست میں حیثیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ پر کسی بھی قسم کی قدغن کی اجازت نہیں تھی۔ شق نمبر (۷۔۸)۔ چنانچہ اس نئے بحران اور مہاراجہ کے ساتھ زبردستی کرنے اور الحاق کی دستاویز کے جعلی ہونے کی وجہ سے ہی انڈیا کے لیے اب کوئی چارہ نہیں رہا تھا کہ وہ اس سلسلے میں کوئی دوسرا راستہ نکالے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو اس وقت عالمی حیثیت ملی۔ جب خود انڈیا نے اقوام متحدہ کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ اور یکم جنوری 1948ء کو فیصلہ کیا گیا کہ ریاست کی حیثیت بدلنے کی کوئی کوشش نہ کی جائے۔ اور کشمیر کی حیثیت میں کسی قسم کی تبدیلی کی اجازت نہ ہوگی اور اس سلسلے میں 17 ریزولوشن پاس کی گئیں۔ جن میں اس متنازعہ حیثیت کا ذکر تھا۔ چنانچہ یو۔این ۱۹۴۷۔۴۸ء قراردادوں میں انڈیا اور پاکستان دونوں سے کسی بھی قسم کے الحاق کی نفی کی گئی اور کہا گیا کہ ریاست کے مستقبل کا فیصلہ جمہوری، آزادانہ اور غیرجانبدارانہ رائے شماری کے ذریعے کیا جائے گا۔

شملہ معاہدہ: چنانچہ شملہ معاہدہ میں بھی یک طرفہ کشمیر کی حدود میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کی مخالفت کردی گئی اور دونوں ریاستوں نے اس پر اتفاق کا اظہار کیا۔ چنانچہ شملہ معاہدے کی شق نمبر 1(11) میں صاف واضح کیا گیا ہے۔ دونوں ملکوں میں سے کوئی یک طرفہ کوئی تبدیلی نہیں لائے گی۔ اس سلسلے میں شک نمبر 6 میں کہا گیا کہ دونوں ریاستیں اس مسئلے کا حل کرنے کے لیے مذاکرات کے ذریعے سفارتی جدوجہد جاری رکھیں گے۔ چنانچہ انڈیا کی طرف سے اس مسئلہ کو انڈیا کا داخلی معاملہ قرار دینا عالمی معاہدہ کے ساتھ، ساتھ شملہ معاہدہ کی بھی سنگین خلاف ورزی ہے۔ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کی قراردادوں کے

مطابق کشمیریوں کے حق خودارادیت کوتسلیم کیا گیا۔اوراقوام متحدہ کے چارٹرآرٹیکل نمبر 1 (2) کے مطابق ریاستوں کے درمیان دوستانہ تعلقات کے لیےضروری ہے کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ برابری کے حقوق کے اصولوں کے مطابق یہ ریاستیں حق خودارادیت کا وعدہ پورا کریں۔ چنانچہ یہ آرٹیکل عالمی معاملات میں عالمی قانون کےتحت مختلف اقوام کوتحفظ فراہم کرتا ہے۔

چنانچہ۱۹۵۲ء جنزل اسمبلی کے اجلاس میں حق خودارادیت کے اس اصول کےتحت قرارداد A(711) 637 میں کہ انسانوں کو بنیادی انسانی حقوق سےلطف اندوز ہونے کے لئے اقوام متحدہ کےممبران نے قرارد یا کہ حق خودارادیت کے اصولوں کوممبر مما لک اورریاستیں مکمل تحفظ فراہم کریں۔اوریہی واحدراستہ نوآبادیاتی کالونیوں کی آزادی کے لیے اہم بنیاد فراہم کرتا ہے۔اوراس میں جی۔ اے ریزولوشن ۱۵۱۴۔۱۹۶۰ء میں خودارادیت کومکمل طور پرتسلیم کیا گیا ہے۔جس کےتحت وہ آزادانہ طور پراپنے سیاسی پوزیشن کے مطابق اپنی معاشی اورمعاشرتی ترقی میں اس حق کا استعمال کریں۔ چنانچہ اس سلسلے میں حق خودارادیت کوآرٹیکل نمبر 1 کےتحت سول اور سیاسی حقوق دونوں میں مکمل طور پرتحفظ فراہم کیا گیا۔اس سلسلے میں ۱۹۶۶ء میں دومزید اصولوں کا اندراج کیا گیا۔اس میں ۱۹۷۰ء تک حق خودارادیت کےاس مروجہ اصول کوقانون کا درجہ مل گیااوراس سلسلے میں ۱۹۷۰ء میں عالمی عدالت نے متعدد باریہ واضح کیا کہ حق خودارادیت کوعالمی قوانین کےتحت مکمل تحفظ حاصل ہے۔اس لیے یہ کہا کہ کشمیر بھارت یاپاکستان کا حصہ ہے۔وہ عالمی قوانین کےتحت اس وقت تک ممکن نہیں ہے۔جب تک کشمیری عوام کوحق خودارادیت مل جائے۔

چنانچہ کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرکے اوراسے انڈیا میں ضم کرکے بھارت نےنوآبادیاتی ریاست کا روپ دھارلیا ہے۔اورحق خودارادیت سے روگردانی کرتے ہوئے بھارت نے جونوآبادیاتی ریاست کا روپ دھارلیا ہے۔اس کی وجہ سے بھارت نے۱۹۶۰ء کےاقوام متحدہ کی جنزل اسمبلی کی قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی کی ہے۔جس میں یہ قرار دیا گیا ہے کہ نوآبادیاتی ریاستوں کو وہاں کے لوگوں کو خودرادیت دیناہوگا جوان کا حق ہے۔

چنانچہ عالمی قانون کےمطابق انڈیا کوکشمیر کی ریاست پرکوئی حق حاصل نہیں ہےاورانڈیا نےاپنے آپ کوایک نوآبادیاتی ریاست کا درجہ دے کراس ریاست کوضم کیا ہے اور ایک غیر قانونی طور پر قابض ریاست کو، اس ریاست کواپنے ملک میں ضم کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔اوراقوام متحدہ کی ۱۹۴۸ء کی قراردادوں کے مطابق انڈیا کومقبوضہ علاقوں کی سرحدیں بدلنے یا آبادی کا تناسب بدلنے کا حق نہیں ہے۔اس سلسلے میں انٹرنیشنل کمیشن آف جیورسٹ نے واضح طور پر کہا ہے کہ انڈیا نے کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کرکے جموں وکشمیر کےلوگوں کے حقوق کی خلاف ورزی کی ہےاور جموں وکشمیر کی ریاست کے معاملے میں عالمی قانون کی خلاف ورزی کی ہے۔چنانچہ انڈیا کی طرف سے آرٹیکل 370 اور 35A کو ختم کرکے اس کواپنا علاقہ قرار دینے اورغیر قانونی طور پرڈومیسائل کے قانون کو بدلنے کا اقدام ہرطرح سے غیرقانونی ہے۔حیرت کی بات تو یہ ہے کہ اس قانون کوتبدیلی کے وقت جموں وکشمیر کی اسمبلی معطل کر دی گئی تھی اور کشمیر کے تمام سیاسی رہنماؤں کوجیلوں میں ڈال دیا گیا تھا یا وہ نظر بند تھے۔جس سے ایک بات واضح ہوتی ہے کہ کشمیر کےعوام کی مرضی کے خلاف بین الاقوامی قوانین کی سنگین خلاف ورزی کی گئی۔چنانچہ آرٹیکل 370 کوختم کرنے کا بنیادی مقصد دراصل یہ ہے کہ نریندرمودی کی خواہش ہے کہ

مسلم اکثریت کواقلیت میں بدل دیا جائے اور جو ہندو، انڈیا کے ساتھ نہیں جانا چاہتے ان کی اکثریت بھی کم کی جائے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں جموں میں غیر ریاستی باشندوں کی خاصی تعداد آباد ہے۔اب ان کو کشمیری سٹیفکیٹ دے دیئے جائیں گےاوریہی سلسلہ وادی میں کیا جائے گا۔ جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے گویا اس ریاست کو ہندو اکثریت بنا کراس کوریفرینڈم کے لیے دیا جائے گا اور یوں ہندوستان تمام کشمیر کوایک منصوبہ بندی کے تحت ہڑپنا چاہتا ہے۔ چنانچہ یہ کام اب کشمیری عوام اورحکومت پاکستان کا ہے۔وہ کشمیر کوہتھیانے کی اس چال کامؤثر جواب دیں۔اور عالمی سطح پرسخت ترین اقدامات کیئے جائیں تا کہ بین الاقوامی قوانین کے مطابق ریاست کےعوام کوحق خودارادیت مل سکے۔یادرہے کہ کشمیر کا بھارت سے الگ ہونا ضروری ہے چاہے یہ علاقے پاکستان سے الگ ہو جائیں۔وجہ صاف ظاہر ہے کہ کشمیر کی ریاست آزاد یا الحاق دونوں صورتوں میں پاکستان کے مفادات میں ہے۔اور مستقل طور پر بھارت میں ضم ہونے کے بعد پاکستان اقتصادی بدحالی کا شکار ہوگا اور پاکستان کی سالمیت خطرے میں پڑ جائے گی۔

نیاعالمی جوڑ، توڑاورجغرافیائی تبدیلیاں۔

دنیا میں تبدیلیاں اکثرآتی رہتی ہیں۔کئی طاقتورترین ریاستیں محدود ہوکررہ گئیں اورکئی ناپید ہوگئیں۔ آج ہم سلطنتِ روم اورفارس یا خلافتِ عثمانیہ اور برٹش ایمپائر کا خواب بھی دیکھ سکتے ہیں۔آج صورتحال بدل رہی ہے۔۲۰۲۰ء میں عالمی میدان میں ایک نیا طاقتور بلاک سامنے آرہا ہےاوروہ چین ہے۔ایک بڑی آبادی والا ملک جوفوجی اوراقتصادی میدان تیز رفتاری سے آگے بڑھ رہا ہے۔ اور یورپ اورنارتھ امریکہ کوبھی پیچھے چھوڑنے کی تیاری میں ہے۔ ہمسایہ میں بھارت ہے۔ جوآبادی کے لحاظ سے ایک بڑا ملک ہے۔مگرمختلف زبانوں اور مذاہب کی وجہ سے اس میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ بحر ہند میں اپنی طاقت کا لوہا منوا سکے۔ دوسری طرف چین نے انتہائی تیزی سے خلیج فارس تک رسائی حاصل کرلی۔جس کے لیے روس اورامریکہ کے درمیان افغانستان میں ایک عرصہ تک جنگ رہی۔اورآخرکار روس کی طاقتور پاور کو دھچکا لگا۔مگر چین نے پاکستان کے ساتھ سابقہ سلک روڈ کے ذریعے گوادر پورٹ تک رسائی حاصل کرلی۔ اورشمالی کشمیر سے اپنے لیے محفوظ راستہ حاصل کرلیا۔۱۹۴۷ء میں گلگت بلتستان کے عوام نے ڈوگرہ راج کے گورنر جنرل گھنسارا سنگھ کوگرفتار کرکے مقامی افواج نے اس علاقے کا عارضی انتظام پاکستان کے سپرد کیا اوریوں ایک طویل علاقہ جوجغرافیائی طور پراہم تھا۔پاکستان کی طرف آگیا۔قراقرم کا یہ رستہ چین کو آگے بڑھنے میں معاون ثابت ہوا اوراب پاک بھارت کے تصادم کے ساتھ چین بھی اس علاقے کی اہمیت کی پیش نظر میدان میں آگیا۔چین نے ۱۹۶۲ء میں اکسائی چن کا ایک علاقہ بھارت کے ساتھ جنگ میں حاصل کرلیا تھا۔اورگلگت و بلتستان کا علاقہ جو پاکستان کے زیرانتظام ہے۔اس کا کچھ حصہ بھی چین کے ساتھ ایک معاہدہ میں اس کے حوالے کردیا تھا۔چین نے شاہراہِ ریشم کا تحفظ بہتر بنانے کے لئے ایک منصوبہ بندی کے ساتھ یہ پروگرام آگے بڑھایا اور بھارت کواس کی خبر تک نہ ہونے دی۔اب امریکہ، اسرائیل، برطانیہ اورخلیج فارس کی عرب ریاستیں اورسعودی عرب نے اس دوران کشمیر کوغیر قانونی طور پر بھارت میں ضم کرنے کے اقدامات میں بھارت کا ساتھ دیا۔وجہ صاف ظاہر تھی کہ امریکہ، چین کا بحرہ عرب تک راستہ روکنا چاہتا تھا۔۱۹۹۰ء سے لیکر ۲۰۱۶ء تک لداخ کے علاقے میں بھارت۔ اسرائیل۔ برطانیہ اورامریکہ کےفوجی ماہرین بھارت کے ساتھ مشقیں کرتے رہے ہیں۔اور بنیادی

مقصد چین کا راستہ روکنا تھا۔ چنانچہ سیاچین گلیشیئر میں بھارتی حکومت کا قبضہ اس بات کا اشارہ تھا کہ بھارت ایک اور وار کرنے والا ہے۔ چنانچہ پاکستان اور چین کے درمیان روابط مزید بڑھائے گئے۔ ۲۰۱۹ء میں کشمیر پر بھارتی اقدام اور لداخ کو کشمیر سے الگ کر کے مرکز میں ضم کرنے کا فیصلہ ایک ایسا اقدام تھا جو پاکستان اور چین دونوں کے لیے خطرے کی گھنٹی تھی۔ جب وزیر اعظم مودی نے اعلان کر دیا کہ ان کا اگلا اقدام آزاد کشمیر اور گلگت و بلتستان ہوگا۔ انہیں شاید عالمی طاقتوں نے وعدہ کیا تھا کہ کسی بھی صورت میں بھارت کا ساتھ دیں گے۔ بھارت کے اس اقدام کے بعد چین نے انتظار کیے بغیر قراقرم ہائی وے کے نزدیکی علاقوں میں فوجی ایڈوانس کر دیا اور پاک فوج کے دستے بھی نارتھ کشمیر پہنچ گئے۔ اور یوں لداخ کے گلوان ویلی میں بھارت اور پاکستان کا شدید فوجی تصادم ہوا جس میں کافی تعداد میں انڈین فوجی مارے گئے۔ اور بھارت کی اہم شاہراہ جس کے ذریعے بھارت قراقرم ہائی ویز اور سیاچین کے علاقے تک جاتا تھا۔ اب چین نے اونچی پہاڑیوں پر قبضہ کر کے بھارت کے ایک طویل علاقے کو اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے۔ تاکہ قراقرم ہائی ویز کو محفوظ رکھا جا سکے۔ دوسری طرف چین نے علاقے کے دوسرے ممالک جن میں نیپال۔ بھوٹان۔ سری لنکا اور بنگلہ دیش شامل ہیں۔ اب اس چین عالمی بلٹ میں شامل کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اور یہ اب ایک عالمی سرد جنگ کا نیا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ مغربی طاقتیں چین کی بڑھتی ہوئی اقتصادی اور فوجی طاقت کو روکنے کی کوششیں کر رہیں ہیں۔ مگر چین گوادر سے ایران کی بندرگاہوں تک رسائی حاصل کر چکا ہے اور اب ایران کے ساتھ بھی تجارتی معاہدہ ہو چکا ہے۔ ایران نے بھارت کے ساتھ تجارتی معاہدات کرنے پر پیش رفت کی تھی۔ مگر بھارت، امریکہ تعلقات کی وجہ سے بھارت نے ایران میں سرمایہ کاری کرنے سے اجتناب کیا۔ چنانچہ ایران نے بھارت سے دوری اختیار کر کے نئے راستے پر گامزن ہونے کی کوشش کی ہے۔ اور اب ایک نیا عالمی بلاک سامنے آ رہا ہے اور اس کی سربراہی چین کے ہاتھوں میں ہوگی اور اس میں نئے کھلاڑی سامنے آئیں گے اور اس نئے بلاک میں کشمیر پھر ایک کانٹا بن کر ان کی درمیان اس وقت تک موجود رہے گا۔ جب تک کہ کشمیری عوام کی خواہشات پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اس دوران بہت سے بحران سامنے آئیں گے۔ چین، ہندوستان کے ۴۸ فیصد پانی کو کنٹرول کرتا ہے اور اس کے اثرات بنگلہ دیش اور ویت نام تک پہنچ سکتے ہیں۔ دوسری طرف بھارت پاکستان کے تین بڑے دریاؤں پر کنٹرول سنبھال رہا ہے۔ جو کشمیر سے نکلتے ہیں اور چوتھا دریا لداخ اور تبت کے راستے سے آتا ہے۔ گلوان رینج سے گزرنے والا دریا، دریائے سندھ میں شامل ہوتا ہے۔ جو شمالی علاقوں سے شروع ہو کر بحرہ عرب میں ختم ہوتا ہے۔ اس لیے کشمیر کے یہ علاقے پاک و ہند دونوں کے لیے خاصے اہم ہیں اور ماحولیات کی تباہی سے بڑا نقصان دونوں ملکوں کو ہی ہوگا۔ اس لیے مسئلہ کشمیر سمیت تمام بحرانوں کا حل جنگ میں نہیں بلکہ باہم مذاکرات سے ہے اور جتنی جلدی بھارت کے سیاستدانوں کو یہ بات سمجھ میں آتی ہے۔ اتنا ہی اس علاقے کے لوگوں کے لئے بہتر ہے۔ مگر افسوسناک صورتحال یہ ہے کہ بھارت، اسرائیل، امریکہ، برطانیہ اور آسٹریلیا سمیت ان ملکوں کے علاوہ سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے ذریعے بھارت کو آگے بڑھنے کے لیے مجبور کر رہا ہے اور بھارت بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ وہ فوجی طاقت کے زور پر چین اور کشمیر کے عوام کو کنارے لگانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ مگر بھارت کو اس بات کا احساس نہیں کہ لداخ کا علاقہ کشمیر سے الگ کر کے

کرے گا اور بھارت ان سنگلاخ پہاڑوں میں کھربوں کا سرمایہ ضائع کرتا رہے گا۔ جانی نقصان اس کے علاوہ ہے۔ اس سے پہلے بھارت نے سیاچن گلیشیئر میں چڑھائی کر کے اس ماحولیاتی گلیشیئر پر آگ لگانے کی کوشش کی اور پاکستان کو مجبور ہو کر اپنے علاقوں کے تحفظ کے لئے فوج روانہ کرنی پڑی۔ آج اس سخت ترین علاقے میں دونوں افواج ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں۔ جہاں فوجی گولیوں سے نہیں بلکہ سخت ترین سردی کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔

اس عالمی سرد جنگ سے اور کیا تبدیلیاں رونما ہوں گی یہ وقت ہی بتائے گا۔ مگر افسوس ناک امر یہ ہے کہ اس جنگ نے کشمیری عوام کی زندگی عذاب بنا دی ہے۔ دونوں اطراف سے کشمیر کے نام پر قتل و غارت گری کے منصوبے بنتے ہیں۔ دونوں طرف کی لیڈرشپ اس متنازعہ ریاست کی صورتحال سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ مودی نے اسی کشمیر میں زیادتی کر کے اور ہزاروں افراد کو بے گناہ قتل کروا کے ہندو آبادیوں میں ثابت کیا کہ وہ ہندو ریاست بنانے کا خواہشمند ہے۔ اور بھارت کو دنیا کی بڑی طاقت بنانے کے خواب دکھا کر پورے بھارت کو نئے بحران سے دوچار کیا۔ آج اس کشمیر پر دنیا خاموش ہے۔ کیونکہ دنیا اپنے اقتصادی مفادات کو دیکھ رہی ہے۔ ان میں سے بعض طاقتوں کے مفادات چین کو روکنا ہے۔ اور علاقے میں بھارت واحد ملک ہے۔ جو چین کے خلاف اقدامات کرنے کے لیے تیار ہے۔ وجہ یہ ہے کہ چین نے بھارت کے اکسائی چین کا علاقہ پر جنگ میں قبضہ کر لیا تھا۔ یہ علاقے لداخ مقبوضہ کشمیر کا حصہ تھے اور ریاست تبت سے بھی ان کا تعلق رہا ہے۔ اب شاید وقت کے ساتھ، ساتھ مختلف علاقوں کی بندر بانٹ ہوگی۔ بھارت، پاکستان اور چین اب خطہ کشمیر میں بری طرح پھنس چکے ہیں۔ چین، پاکستان تجارتی شاہراہ شمالی کشمیر سے ہو کر آتی ہے۔ اور اس علاقے کو تحفظ فراہم کرنے کے لیے گلوان ویلی اور لداخ کے علاقوں پر بھارت کا قبضہ خطرے سے خالی نہیں۔ اس لیے چین اور پاکستان دونوں کے لیے یہ علاقے اہم ہیں۔ مقبوضہ کشمیر میں جدوجہد آزادی میں کمی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب وقت ہی بتائے گا کہ اونٹ کس کروٹ بدلتا ہے۔ کشمیر آزاد ہو یا پاکستان میں شامل ہو دونوں صورتوں میں پاکستان کے مفاد میں ہے۔ کیونکہ ایسی صورت میں یہ ریاست بھارت سے الگ ہو جائے گی اور پاکستان کے ان دونوں صورتوں میں دفاعی میدان میں اخراجات کم ہو جائیں گے۔ کیونکہ ریاست کشمیر کی تجارت زیادہ تر پاکستان سے ہوگی۔ اور اس سے پاکستان کے دریاؤں کو تحفظ حاصل ہوگا اور پانی کا تسلسل برقرار رہے گا۔ پاکستان اس سلسلے میں کشمیر کی ریاست سے بہتر تعلقات قائم کر سکتا ہے۔ مگر بھارت کی ہندوانہ ذہنیت پر بھروسہ نہیں کر سکتا۔ اب وقت ہی بتائے گا کہ پاکستان کی فوجی اور سیاسی قیادت سیاسی بصیرت کا مظاہرہ کر سکے گی یا کہ نہیں۔ کیونکہ جنگ تباہی اور مذاکرات کامیابی کا واحد راستہ رہ گیا ہے۔

۵ اگست ۲۰۱۹ء کا کشمیر کا طویل ترین لاک ڈاؤن ۲۰۲۰ء کا وائرس لاک ڈاؤن (lock down) پوری دنیا میں قیامت کا منظر۔

کشمیر ہر سال ایک نئے بحران سے دوچار ہوتا رہا ہے۔ مگر انڈین حکومت نے ۲۰۱۹ء میں ریاست کشمیر کے اہم اختیارات ختم کرتے ہوئے پارلیمنٹ کے ذریعے دفعہ 370 اور 35A کو ختم کر دیا۔ یہ دونوں دفعات کشمیر کو خصوصی حیثیت دیتے تھے۔ جس سٹیٹ سبجکٹ کا قانون بھی لاگو تھا۔ جو مہاراجہ کشمیر کے دور کا تھا۔ یعنی کوئی بھی شخص باہر سے آ کر نہ جائیداد خرید سکتا ہے اور نہ ہی وراثتی باشندہ بن سکتا ہے۔ گویا اسے ریاستی معاملات میں کوئی سیاسی مداخلت کا حق نہیں تھا۔ یہ اختیارات ریاست کو باہر سے آنے والوں سے

تحفظ فراہم کرتا ہے۔ چنانچہ اقوام متحدہ کی قراردادوں اور پاکستان اور ہندوستان دونوں کی رضامندی سے یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ ریاست کی حیثیت میں کسی بھی قسم کی تبدیلی کا حق پاکستان اور ہندوستان دونوں کے پاس نہیں ہے۔ اور اس کا فیصلہ کشمیری عوام کو کرنا ہے کہ وہ ریاست کے بارے میں کیا فیصلہ کرتے ہیں اور یہ فیصلہ اقوام متحدہ کی سرپرستی میں ہوگا۔ گویا ریاست کوئی بھی حصہ پاکستان اور انڈیا کے لئے ضم کرنے کا حق ان کو نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ریاست متنازعہ ہے اور کسی بھی قسم کی ایسی مداخلت بین الاقوامی قوانین اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کی کھلی خلاف ورزی ہوگی۔ مگر بھارت نے خصوصی اختیارات کو ہٹانے اور نئے ڈومیسائل قوانین نافذ کرنے کا اعلان کر کے دور نوآبادیات کی روایت قائم کی اور تمام اختیارات واپس لے کر جموں و کشمیر کو بھارت میں ضم کرتے ہوئے تمام اختیارات واپس لینے کے ساتھ لداخ اور کارگل کے وسیع علاقے کو کشمیر سے الگ کر کے براہِ راست مرکز کے زیر انتظام کر دیا۔ اس سلسلے میں کشمیری عوام کی رائے نہیں لی گئی اور کشمیر اسمبلی سے اس سلسلے میں قرارداد سامنے لانے کی ضرورت تک محسوس نہ کی گئی اور یوں حکومت کو برخاست کر کے ایمرجنسی نافذ کر دی اور ایمرجنسی بھی ایسی کہ خطے کی تاریخ میں ایسا لاک ڈاؤن نہیں دیکھا گیا۔ ۵ اگست ۲۰۱۹ء سے ایک سال بعد تک لاک ڈاؤن کا سلسلہ اسی طرح جاری ہے اور اب کشمیر کا مہینہ آرہا ہے۔ گویا یہ عرصہ ایک سال سے زیادہ کا ہو گیا ہے۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے جب پوری دنیا میں کشمیر کے لوگ اس لاک ڈاؤن کو ختم کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اس دوران مارچ ۲۰۲۰ء کو پوری دنیا کرونا وائرس کی لپیٹ میں آ گئی۔ جس کی ابتدا چین سے ہوئی تھی اور دیکھتے ہی دیکھتے یورپ اور ایشیا، نارتھ امریکہ اور افریقہ تک اس وباء نے ڈیرے ڈال دیئے۔ اور یوں جو لاک ڈاؤن کشمیر میں کیا گیا پوری دنیا لاک ڈاؤن کا شکار ہوگئی۔ جس میں نارتھ امریکہ کے تمام ممالک شامل تھے۔ اس دوران کشمیری تنظیموں اور پاکستان کی حکومت نے عالمی سطح پر آواز ضرور بلند کی۔ حکومت کی سرپرستی کرنے والے اسلامی ممالک جن میں سعودی عرب اور خلیجی ریاستیں شامل تھیں۔ انہوں نے کشمیری عوام سے غداری کی اور پاکستان کو مین وقت میں دھوکا دیا اور پاکستان پر دباؤ ڈالا کہ وہ بھارت سے مسئلہ کشمیر پر تصادم کی پالیسی نہ اپنائے۔ اس سلسلے میں امریکہ اور اسرائیل کا ایجنٹ سعودی پرنس سلمان نے پاکستان کی کامیاب خارجہ پالیسی کو ناکام بنا دیا اور وزیر اعظم عمران خان نے ان کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ گو موصوف نے اس سلسلے میں ناراضگی کا ضرور اظہار کیا۔ مگر موصوف اس سے آگے نہ بڑھ سکے۔ گو موصوف نے اسلامی کانفرنس سے علیحدگی کی دھمکی دی تھی۔ مگر انھوں نے اس سلسلے میں ترکی، ملیشیا اور چند دوسرے ممالک سے ضرور رابطہ قائم کیا۔ مگر پاکستان اپنے لاکھوں تارکین وطن سے عربوں کا زرمبادلہ کماتا ہے۔ اس لیے ایک سفارتکار دوست کے مطابق ان کا یہ علیحدگی کا نعرہ اور ناراضگی دراصل ملکی معاملات میں اخباری شہرت کے لئے ہے۔ حقیقت میں پاکستان کے جرنل حضرات سعودی عرب کے وظیفہ خوار ہیں۔ اور جنرل راحیل شریف اسلامی فورسز کا کمانڈر شریف ہے۔ حالانکہ پاکستان نے سعودی عرب کے خلاف خوب زبان استعمال کی مگر اندر ہی اندر پاکستان سعودی عرب فوج کی صورت میں امداد فراہم کر رہا ہے۔ اور فوجی جرنیل باقاعدہ سعودی عرب سے مالی معاونت حاصل کر رہے ہیں۔ اور جنرل راحیل شریف اس وقت سعودی عرب میں کئی ملین ڈالر سالانہ مالی مفادات حاصل کر رہے ہیں۔ اس کا اظہار ریاض میں مقیم ایک پاکستانی آفیسر کی وہ باتیں تھیں۔ جو موصوف نے راقم کو بتائیں۔ جو سعودی عرب میں کافی عرصہ رہے تھے اور وہ سارے معاملات جانتے تھے۔ افسوس کا مقام تو یہ ہے کہ اسلامی

دنیا کا طاقتور ترین ملک پاکستان کی نبض پر صہیونی طاقتوں کا ہاتھ ہے۔ اور اپنے ایجنٹ سعودی عرب اور خلیجی ریاستوں کے ذریعے پاکستان کو چند جرنیلوں کی مدد سے کنٹرول کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کشمیری مرتے رہے اور پاکستان کے حکمران بھارت کو لاہور کے ذریعے پورے کاروباری مفادات دیتے رہے۔ اور کرتارپور کروئیڈور کھول کر بھارت کو مزید آگے بڑھنے کا موقع دیا۔ جبکہ دوسری طرف سے سیز فائر لائن پر وہ ایک دوسرے پر گولے پھینک رہے ہیں اور دونوں طرف کے شہری آبادیاں تباہ و برباد ہو رہی ہیں۔ اس دوغلی پالیسی کی وجہ سے پاکستان اندرونی اور بیرونی بحرانوں سے اسی طرح دوچار رہے گا۔ اور کشمیری اسی طرح بھارت کی زیادتیوں کا شکار ہوتے رہیں گے۔ ۲۰۲۰ کا یہ بحران تاریخ میں ضرور یاد رہے گا۔ اس بحران نے کشمیر سمیت پوری دنیا میں سنگین ترین بحران پیدا کیا۔ اور وباء نے دنیا کو اپنے لپیٹ میں لیا۔ اس بحران کے دوران کروڑوں افراد کا مالی اور جانی نقصان ہوا۔ بڑے، بڑے شہر سنسان ہو گئے۔ لوگ گھروں میں بند ہو کر رہ گئے۔ یورپ اور نارتھ امریکہ میں چند سال قبل نقاب پہننے پر پابندی عائد کر دی گئی تھی اور قانونی چیلنج کے بعد نقاب پر پابندی تو ختم ہوئی۔ مگر نقاب پہننے والی خواتین کو ہراساں کیا جاتا رہا۔ مگر ایسا وقت آیا کہ ہر فرد کو نقاب پہننے پر مجبور ہونا پڑا۔ اللہ کی شان دیکھیے کہ وہیں خواتین، خواتین کو بتا رہی تھیں کہ کس طرح آپ چہرے کو بیماری سے محفوظ کرنے کے لیے نقاب پہن سکتیں ہیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ جو اس کے خلاف تھے ان کو بھی اس طریق کار پر مجبوری سے عمل کرنا پڑا۔ قدرت انسان کو کیا، کیا تجربات دکھاتی ہے۔ کشمیر کا خطہ اب تین ایٹمی طاقتوں کے لئے سرد جنگ کا میدان بن گیا ہے۔

۷۳ سال کے بعد آج بھی کشمیر جل رہا ہے مگر صورت حال بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے اور اس کے حصے بخرے کرنے کے لیے اب چین بھی میدان میں آ گیا ہے کہ چین کو مشرق وسطیٰ اور یورپ تک پہنچنے کے لیے شاہراہِ ریشم کا تاریخی دروازہ مل گیا ہے۔ جس کے ذریعے چین اب گرم پانیوں تک پہنچ گیا ہے۔ گرم پانیوں تک رسائی کے لیے روس نے بھی ایک طویل جنگ لڑی۔ مگر امریکہ اور یورپین طاقتوں نے پاکستان کو آگے کر کے روس کو افغانستان میں روک دیا اور اس جنگ کی وجہ سے روس اپنی طاقت کھو بیٹھا۔ مگر چین نے نہایت ہی بہتر حکمت عملی سے صورتحال کو اس طریقے پر لانے کی کوششیں کیں۔ کہ قراقرم ہائی ویز کے پورے علاقے کو گزشتہ نصف صدی سے کنٹرول کرنے کے لئے اہم اقدامات کیے۔ کچھ علاقے پاکستان سے ایک معاہدہ کے تحت حاصل کر لیے اور بھارت کے زیر انتظام جموں و کشمیر کے اکسائی چن کا ایک طویل پہاڑی سلسلہ اپنے قبضے میں لے لیا۔ ۲۰۱۹ء میں بھارت نے کشمیر میں بین الاقوامی قانون کے خلاف ورزی کر کے جب لداخ کا علاقہ مرکز کے حوالے کر دیا اور گلگت و بلتستان اور آزاد کشمیر پر حملے کی دھمکی دی تو چین کو پریشانی ہوئی۔ کیونکہ لداخ کے علاقوں سے قراقرم ہائی وے تک کا راستہ بھارتی حکومت ایک منصوبہ بندی کے تحت بنا رہی تھی۔ تاکہ اچانک حملہ کر کے چین کا راستہ روکا جا سکے۔ چنانچہ جب انڈیا نے امریکہ اور یورپی طاقتوں کے دباؤ میں آ کر یہ منصوبہ سازی شروع کی تو چین نے صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے فوری لداخ کے اہم علاقوں پر چڑھائی شروع کر دی اور بھارت کی دفاعی لائن توڑ دی۔ اور یوں بھارت کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ دوسری طرف پاکستان نے بھی شمالی علاقوں میں فوجی طاقت میں اضافہ کر دیا تاکہ ممکنہ حملے کا جواب دیا جا سکے۔ یاد رہے کہ بھارت نے سیاہ چین گلیشئر کے علاقوں پر قبضہ کر کے آگے بڑھنے کی راہ ہموار کر دی تھی۔ مگر اس دفعہ بھارت کو دو طاقتوں کا سامنا تھا۔ چنانچہ بھارت کو لداخ میں خطرناک صورتحال کا سامنا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ

بھارت کے سات بڑے دریا بھارت سے ہو کر گزرتے ہیں۔ چنانچہ لداخ اور تبت کے علاقے بھارت کو 48 فیصد پانی مہیا کرتے ہیں۔ دوسری طرف دریائے سندھ بھی لداخ سے آتا ہے اور پاکستان کے تین بڑے دریا چناب، جہلم اور نیلم جسے کشن گنگا کہا جاتا ہے مقبوضہ کشمیر سے آتے ہیں۔ چنانچہ اگر کشمیر کا مسئلہ حل نہ ہوا۔ تو بھارت اور پاکستان دونوں معاشی بحران سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ کشمیر دونوں ملکوں کے ماحولیاتی اور زرعی نظام کو تباہ کر سکتا ہے۔ اب ایسی صورتِ حال میں کیا بھارت اور پاکستان صورتحال کا تجزیہ کر کے کشمیری عوام کے ساتھ ایک میز پر آ سکتے ہیں۔ یہ ایک ایسا سوال ہے۔ جس کا جواب اس وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ یہ بحران جنوبی ایشیا میں ایک خطرناک ایٹمی جنگ کی صورتحال اختیار کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں عالمی دباؤ کے ساتھ، ساتھ دونوں ملکوں کی لیڈر شپ کو حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے کشمیری عوام کی رضامندی سے دیرپا امن کی طرف پیش رفت کرنی ہوگی اور یہی واحد راستہ رہ گیا ہے ورنہ بھارت کی جارحانہ کوششیں ختم نہیں ہونگی اور کسی بھی وقت کسی ایک ملک کی مہم جوئی پورے خطے کو اپنی لپیٹ میں لے جا سکتی ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ انڈیا ایک بہت بڑی آبادی والا علاقہ ہے اور ایک بڑی تجارتی منڈی ہے۔ جو یورپ اور نارتھ امریکہ کی معاشی حالت کو برقرار رکھنے میں معاون ہو سکتی ہے اور چین کی بڑھتی ہوئی اقتصادی طاقت کے درمیان رکاوٹ بن کر اپنے سیاسی مفادات بھی حاصل کر سکتی ہے اور امریکا سمیت اس کے ایجنٹوں کا تعاون بھی حاصل کر سکتی ہے۔ امریکا، برطانیہ اور آسٹریلیا پہلے ہی بھارت کے ساتھ اس میدان میں تعاون کر رہے ہیں اور اسرائیل ان کا سرغنہ ہے۔ گویا اس وقت چار مضبوط ملک اور ان کے ساتھ ان کی زیرِ سرپرستی ریاستیں جن میں سعودی عرب اور خلیج فارس کی چھوٹی، چھوٹی شہری ریاستیں ہیں۔ جو اپنے تیل اور منی لانڈرنگ مرکز کی وجہ سے مالی میدان میں خاصی طاقتور ہیں اور ان کی سرپرستی اسرائیل کے بینک کر رہے ہیں۔ چنانچہ اب یہ اسلامی ریاستیں بھی بھارت میں سرمایہ کاری کر رہی ہیں اور بھارت کے ساتھ میدان میں ہیں۔ دوسری طرف چین کو صورتحال کا علم ہے۔ اس لیے چین اپنی راہداری کو محفوظ رکھنے کے لیے لداخ کے ایک بڑے حصے پر کنٹرول کرنے کے لیے آگے بڑھ چکا ہے۔ اور اب چین، پاکستان، روس مین ملک ایک بلاک کی صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ جس میں پاکستان کے علاوہ ایران اور ترکی بھی شامل ہو سکتے ہیں۔ اب پاکستان کے لئے واحد رستہ یہی رہ گیا ہے کہ وہ خطے میں اپنے آپ کو بھارتی جارحیت سے محفوظ رکھنے اور خطہ کشمیر کا مستقل حل نکالنے کے لیے ان ممالک کی مدد حاصل کرے۔ اس طرح جب دو بلاکوں کا ٹکراؤ کا خوف بڑھے گا۔ تو بھارت کی سرپرستی کرنے والے بلاک کو دباؤ کا سامنا کرنا پڑے گا۔ بھارت رضاکارانہ طور پر کسی بھی صورت میں مذاکرات کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ اس کا واحد طریقہء کار عالمی دباؤ ہے۔ جنگ بھارت کے لیے بہتر ہے نہ پاکستان کے مفاد میں ہے۔ کیوں کہ آخری حربہ ایٹمی ہتھیاروں کا استعمال ہے اور کوئی بھی ملک اس کے لیے تیار نہیں ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ عالمی تنظیمیں اور دیارِ غیر میں مقیم کشمیری رہنما مسلسل پاکستان سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ اس خطرناک راستے سے نکلنے کا واحد راستہ عالمی سطح پر دباؤ اور بھارت کی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کو بے نقاب کرنا ہے۔ جب تک اس کی طرف توجہ نہیں دی جائے گی۔ بحران خطرناک حد تک بڑھتا جائے گا۔

ساؤتھ ایشیاء فاؤنڈیشن کے کرسٹوفر تھامسن سے ملاقات ۱۹۹۳ء اور کشمیر پر یاداشت پیش کی۔

وزیر اعظم سردار سکندر حیات صاحب کی رہائش گاہ پر ان سے ملاقات۔

۲۱۲

تحریک آزادی کے دو نامور مجاہد (دائیں طرف سے) میرے تایا حوالدار میجر راجہ سید اکبر خان مرحوم کمپنی کمانڈر پونچھ سیکٹر ۱۹۴۷ء اور میرے والد راجہ بلور خان مرحوم کمپنی کمانڈر پونچھ سیکٹر اور وار وٹرن دوسری جنگ عظیم،

جنہوں نے جنگ کے دوران پونچھ کی ریاست میں مقامی شہریوں کی دردناک صورت حال کا ذکر کیا۔ جس میں بے شمار غیر مسلم خاندان ہلاک وزخمی ہوئے اور بے شمار ملک بدری سے دوچار ہوئے۔ یہ وہ لوگ تھے۔ جو صدیوں سے یہاں آباد تھے۔ موصوف نے معرکہ نانگا پیر میں ڈوگرہ فورس کی شکست کے بعد بچوں اور عورتوں کو اپنی حفاظت میں راولاکوٹ کینٹ میں منتقل کیا۔ اور جنگ کی تباہ کاریاں پر قیادت کو سخت ترین تنقید کا نشانہ بنایا۔ جن کی وجہ سے ریاست بھر میں قتل عام کا سلسلہ چل نکلا۔

۲۱۳

تحریکِ کشمیر برطانیہ کے بانی صدر سید منور حسین مشہدی صاحب کے ساتھ برمنگھم انگلینڈ میں انٹرنیشنل کشمیر کانفرنس کے بعد خصوصی ملاقات اور مسئلہ کشمیر کے بارے میں ان کے خیالات۔

۱۹۹۷ء میں پارلیمنٹ ہاؤس کے سامنے کشمیریوں اور سکھوں کا مشترکہ مظاہرہ۔

214

۹ اگست ۱۹۹۷ء کو ریڈیسن ہوٹل میں کشمیر پر ایک سیمینار کے دوران کینیڈا کے سابق سفارتکار جان سمال، سلطان محمد خان سابق سیکرٹری خارجہ پاکستان اور جناب بشیر حسین ساؤتھ ایشین سنٹر کے ڈائریکٹر کے ساتھ سیمینار کے اختتام پر۔

جہاں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر نشاندہی کی گئی۔ اس قسم کے سیمینار پوری دنیا میں کروائے گے۔ مگر عملی طور پر اقوام متحدہ میں ہماری ناکام خارجہ پالیسی کی وجہ سے ہم بھارت سے ہر میدان میں مات کھا گئے۔

215

۱۹۹۰ء میں راقم نے لندن میں مختلف تنظیموں کی دعوت پر دورہ کیا۔ واپسی پر پاکستان کا پروگرام بن گیا۔ اسی دوران اسلام آباد میں کشمیر انفارمیشن سنٹر میں جماعت اسلامی کے مرکزی دفتر میں امیر جماعت اسلامی پاکستان قاضی حسین احمد صاحب سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔

موصوف کشمیریوں کے لئے ایک انتہائی درد دل رکھنے والے رہنما تھے اور موصوف نے اس سلسلہ میں جماعت اسلامی کی طرف سے متاثرینِ سیز فائر لائن کی مالی امداد کے علاوہ مقبوضہ کشمیر سے آنے والے

مہاجرین کی امداد کے سلسلے میں بھی تفصیلی بات چیت کی۔موصوف نے کشمیری عوام کی جدوجہد آزادی اور حقوق کے لیے عظیم جدوجہد کی۔

216

۱۹۹۰ء کے دوران کشمیر سینٹر اسلام آباد میں تحریک آزادی کشمیر کے ایک نامور رہنما پروفیسر الف۔دین۔ ترابی صاحب سے ملاقات میں میرے گاؤں کے جناب راجہ عبدالحکیم صاحب اور بشیر عثمانی صاحب بھی ہیں۔میرے ساتھ بائیں صاحب کی شناخت نہیں ہوسکی۔

موصوف ایک اچھے صحافی اور معزز مصنف بھی تھے۔موصوف نے مجھے تحریک آزادی 'منزل بمنزل' کی ایک کتاب پیش کی۔جس میں موصوف نے میرے چند مضامین بھی شامل کیے تھے۔افسوس کے بہت سے بےلوث لوگوں کی قربانیاں اپنوں اور غیروں کی غلطیوں سے ضائع ہوگئیں۔

217

کشمیر پر ایک سیمینار میں بشیر حسین خان، سفیر پاکستان مسٹر مہدی صاحب، کونسل جنرل چوہدری محمد اشرف اور راقم کی تصویر۔

مسئلہ کشمیر کینیڈا اور نارتھ امریکہ کے علاوہ یورپ میں مسلسل سیمیناروں کے ذریعے کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر آواز بلند کی جاتی رہی اور اس سلسلے میں کشمیری اور پاکستانی کمیونٹی نے آواز اٹھانے میں بھرپور کردار ادا کیا۔مگر بدقسمتی سے پاکستان میں اقتدار کی دوڑ میں شریک سیاسی لیڈران کی جدوجہد سے فائدہ نہ اٹھا سکے اور بروقت بھارت کی زیادتیوں کے خلاف آواز نہ اٹھا سکے۔

۲۱۸

ورلڈ کشمیر فریڈم موومنٹ کے چیئرمین ڈاکٹر محمد ایوب ٹھاکر مرحوم ۱۹۹۰ء کے دورانیے میں عالمی سطح پر مقبول ہوئے۔وہ مقبوضہ کشمیر سے تعلق رکھتے تھے اور بھارت کے خلاف آواز بلند کرنے پر ان کے خلاف وارنٹ گرفتاری جاری کیے گئے۔چنانچہ وہ کچھ عرصہ سعودی عرب رہنے کے بعد لندن میں مقیم ہوگئے اور اپنی تنظیم کا مرکز لندن میں بنایا۔اکثر دوروں پر روانگی کے دوران ان سے رابطہ رہا۔موصوف کینیڈا تشریف لائے تو راقم کے گھر بھی تشریف لائے۔برمنگھم کانفرنس میں جو تحریک کشمیر برطانیہ کے صدر سید منور حسین مشہدی مرحوم نے بلایا تھا۔اس کانفرنس میں مجھے بھی شرکت کی دعوت دی گئی اور وہاں پر دوسرے مندوبین کے ساتھ، ساتھ ڈاکٹر صاحب بھی آئے ہوئے تھے۔ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔ برمنگھم میں، میں ایک ہفتہ مقیم رہا۔وہاں دوسرے بہت سے کشمیری اور پاکستانی سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں ہوئیں۔موصوف ایک نیک سیرت شخصیت تھے اور کشمیری مسلمانوں کے حق میں آواز بلند کرتے رہے۔موصوف کے ساتھ لندن میں کافی وقت گزارا اور ان کے آفس میں کشمیر کے سلسلے میں مذاکرات ہوتے رہے۔جب میں پاکستان گیا۔تو چند ہفتوں بعد وہ بھی اسلام آباد تشریف لائے اور مختلف مواقع پر ان سے بات چیت ہوتی رہی۔موصوف ایک انتہائی ملنسار اور کشمیری عوام کے ساتھ اور پاکستان کے ساتھ قریبی لگاؤ رکھتے تھے۔ان سے بہت سے لوگوں کو نظریاتی اختلافات بھی تھے۔مگر ان کی کشمیر کے ساتھ وابستگی حد سے زیادہ تھی۔یہی وجہ ہے کہ ایک دفعہ میری اہلیہ نے ان سے کہا۔ٹھاکر صاحب اپنی صحت پر بھی توجہ دیں۔اتنی مصروفیت اچھی نہیں۔کچھ ہی عرصے بعد موصوف کے بارے میں خبر آئی کہ وہ وفات پاگئے ہیں۔ان کی وفات پر دنیا بھر میں افسوس کا اظہار کیا گیا۔وہ امت مسلمہ کے اتحاد کے حامی تھے۔ان کے تعلقات پاکستان کے سابق وزیراعظم میاں نواز شریف سے بھی بہت قریبی حد تک تھے۔ ان کا جذبہ خدمت دیدنی تھا۔موصوف دیارِ غیر سے مقبوضہ کشمیر کے لوگوں کی مدد کرتے رہے۔جو بھارتی ظلم وستم سے خاندان گزر اوقات نہ کرسکتے تھے۔تو موصوف ان کی مدد کرتے تھے۔میری ان سے آخری ملاقات اسلام آباد میں ہوئی۔جہاں موصوف ایک دعوت میں شریک تھے۔میں نے ان کو دوبارہ مانٹریال آنے کی دعوت دی۔موصوف کا کہنا تھا کہ اگلی دفعہ وہ پورے خاندان سمیت آئیں گے۔ افسوس کہ زندگی ان سے وفا نہ کرسکی۔ ۲۲۰ تک

۲۳۰

ہیومن رائٹس کونسل آف انڈیا کے سیکرٹری جنرل جناب ٹپن بوس (TapinBose) کینیڈا میں مانٹریال کے ایک سیمینار میں ۲۰۰۰ء میں درمیان میں راقم کے ہمراہ۔

موصوف نے انڈیا اور خصوصاً کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر شدید تنقید کی اور کہا کہ مسئلہ کشمیر کا حل پاکستان اور انڈیا دونوں کے لیے ضروری ہے۔تاکہ انسانی حقوق کی طرف توجہ دی جاسکے اور جنگوں پر اخراجات کو کم کیا جاسکے۔برصغیر کی مجبوری یہی ہے کہ ہم جنگی مہموں پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔

۲۳۱

۱۹۹۶ء میں مقبوضہ کشمیر کے نامور صحافی ظفر معراج صاحب سرینگر سے کینیڈا ساؤتھ ایشوی ایشن آف انٹرنیشنل آفیسرز کے سربراہ ڈاکٹر دیاور ما کی دعوت پر "پرواز" کے ایک اجتماع میں کینیڈا تشریف لائے۔ موصوف کا تعلق چونکہ شہر سے تھا۔اس لیے زیادہ تر امن کی کوششوں میں کشمیر کا ذکر ہی ہوتا تھا۔چنانچہ راقم کو بھی اس کانفرنس میں خصوصی طور پر خطاب کی دعوت دی گئی۔موصوف کینیڈا کے مختلف شہروں میں گئے۔اور مقبوضہ کشمیر کی صورتحال پر تفصیلی خطاب کیا۔ان کا کہنا تھا کہ دونوں ملک بھارت اور پاکستان کشمیر پر سیاست کررہے ہیں اور کشمیر کے لوگ دونوں جانب سے مر رہے ہیں۔اس قتلِ عام کا فائدہ صرف دونوں ملکوں کے سیاست دان اٹھا رہے ہیں۔اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ دونوں ملکوں کے درمیان جنگی جنون کی وجہ سے ان ملکوں کے دفاعی بجٹ میں اربوں ڈالر کا اضافہ ہوا ہے۔برصغیر میں آبادی میں اضافہ اور بیروزگاری کی وجہ سے صورتحال ویسے ہی خراب ہے۔اگر یہ دونوں ملک معاملات پر توجہ دیں۔غربت اور بےروزگاری کی طرف توجہ دیں اور عالمی منڈیوں سے اسلحہ خریدنے کی بجائے یہ رقم اندرون ملک سرمایہ کاری پر صرف کریں تو ان کا معیارِ زندگی بڑھ سکتا ہے اور کروڑوں لوگ غربت کی زندگی سے آسودہ حالی کی طرف آسکتے ہیں۔ ہر سال ہزاروں بےگناہ عام افراد مقبوضہ کشمیر میں اس مہم جوئی کی نظر ہو رہے ہیں اور مقبوضہ کشمیر ایک قید خانہ بن گیا ہے۔اور اس کا واحد حل یہ ہے کہ دونوں ملک کشمیری عوام کی

خواہشات کے مطابق اس مسئلہ کا حل تلاش کریں اور ایک دوسرے کو فتح کرنے کا خیال ترک کر کے مذاکرات کا راستہ اختیار کریں۔ڈاکٹر مطلوب حسین انجمن پاکستان کے لیڈر بشیر حسین خان اور پروفیسر پرویز حیات صاحب کے ساتھ ان کی نشست ہوئی۔موصوف کا کہنا تھا کہ کوئی بھی مقبوضہ کشمیر کا لیڈر جب دیار غیر کا دورہ کرتا ہے تو اس کو دوسرے دورے سے قبل یہ مشورہ ضرور دیا جاتا ہے کہ جناب آپ دورے پر جارہے ہیں۔تنقید کرتے ہوئے رویہ درمیانہ رکھیں۔ ورنہ آپ کو گھر پہنچنے میں مشکلات درپیش آسکتی ہیں۔اس بات کا خیال رکھیں۔ واپس آپ نے دہلی ائرپورٹ پر اترنا ہے اور سرینگر ایئرپورٹ سے گھر پہنچنے تک کچھ بھی ہوسکتا ہے۔اس لیے ہمیں ساری صورت اور معاملات کے بارے میں احتیاط سے اپنا پیغام بھی دینا ہوتا ہے اور واپسی کی سلامتی کے لیے دعائیں بھی کرنی ہوتی ہیں۔آپ لوگ تو آزاد دنیا کے باسی ہو۔ جو چاہو کر سکتے ہو۔مگر ہمارے خاندان ہیں۔ گھر ہیں۔ روزمرہ زندگی کی مجبوریاں ہیں۔اس لئے مقبوضہ کشمیر کے لیڈران کو کوسنے کی بجائے آزاد کشمیر کے لیڈران اور دیار غیر میں مقیم کشمیری باشندوں کو مؤثر طریقے سے آواز بلند کرنی ہوگی۔موصوف کا کہنا تھا کہ دونوں طرف کے سیاستدانوں کے روابط ضروری ہیں۔مقبوضہ کشمیر کے سیاستدانوں کو آزاد کشمیر کے دورے کرنے کی اجازت ہونی چاہیے اور اس میں ہندو مسلم اور بدھ مت کے پیروکار سب ہی کو بلایا جانا چاہیے اور ان سے بھی مشاورت کرنی چاہیے۔ تاکہ اس ریاست کے تمام لوگوں کا متفقہ فیصلہ سامنے آسکے۔ یا کم از کم ان کی رضامندی شامل ہو۔اس طرح سیاسی مذاکرات کا راستہ نکالا جاسکتا ہے۔ورنہ جنگ سے نہ بھارت اس مسئلہ کا حل نکال سکتا ہے اور نہ ہی پاکستان کوئی پیش رفت کرسکتا ہے۔اس سلسلے میں موصوف کا کہنا تھا کہ دونوں طرف کی قیادتوں کو آگے بڑھنا ہوگا اور کشمیریوں کے ساتھ مل بیٹھ کر کوئی ایسا راستہ نکالنا ہوگا۔جس سے پاکستان، بھارت اور کشمیری تینوں مطمئن ہوسکیں۔اس سلسلے میں کشمیریوں کو بزور بندوق پابند سلاسل کر کے امن کی امید نہیں کی جاسکتی۔

۲۳۶

۱۹۹۰ء کے دورانیے میں مجھے تین دفعہ انگلینڈ کے تفصیلی دورہ کا موقع ملا۔وہاں ہر دعوت میں شریک ہوا اور چند سیمینار سے خطاب کا موقع بھی ملا۔ میرا بنیادی مقصد یہ تھا کہ میں انگلینڈ کی کشمیر کمیٹی کے بارے میں جاننے کی کوششیں کروں کہ وہ کس طرح متحد ہو کر کشمیر کو یورپین یونین میں اٹھاسکتے ہیں۔اس سلسلے میں یہ بات تو یقینی ہے کہ اس وقت کشمیریوں کی تعداد انگلینڈ میں آٹھ لاکھ سے زیادہ تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ممبران بھی خاصی تعداد میں تھے اور چند لارڈ بھی تھے۔ بہت سے شہروں کے مشیر بھی کشمیری تھے۔ کشمیری کاروبار اور رئیل سٹیٹ میں بھی خاصے کامیاب تھے اور سیاسی میدان میں بھی ان کو خاصی دسترس حاصل تھی۔مگر عملی طور پر آزاد کشمیر کے لوگ اکثر برادریوں اور سیاسی جماعتوں میں تقسیم پائے گئے۔ میرے اکثر دعوت دینے والے حضرات راجپوت تھے۔سوائے تحریک کشمیر برطانیہ کے چیئرمین سید منور حسین مشہدی صاحب، ڈاکٹر ایوب ٹھاکر مرحوم اور ڈاکٹر نذیر گیلانی صاحب میرا بنیادی مقصد تو ان تین شخصیات سے ملاقات کا تھا۔ان تینوں شخصیات سے تفصیلی ملاقات ہوئی اور ان کا شکرگزار ہوں کہ ان سب نے اپنی بساط کے مطابق مہمان نوازی کا حق ادا کیا۔ یہ تصویر برمنگھم میں ایک سیمینار کی ہے۔جس میں دائیں سید منور حسین مشہدی صاحب صاحب تیسرے نمبر پر ڈاکٹر ایوب ٹھاکر مرحوم اور راقم ہیں۔ دوسرے احباب مندوبین میں تھے۔نام یاد نہیں رہے۔سید منور حسین مشہدی صاحب تحریک کشمیر برطانیہ کے بانی صدر تھے اور ایک مؤثر سیاسی شخصیت تھے۔موصوف ایک مذہبی شخصیت تھے۔ سیاسی طور پر جماعت اسلامی سے متاثر تھے۔خطہ کشمیر کو استواب رائے کے ذریعے فیصلہ کروانے کے حامی تھے اور بھارت میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر موصوف ایک منظّم جدوجہد کررہے تھے اور پورے برطانیہ میں موصوف کی ایک مؤثر آواز تھی۔موصوف کے ساتھ میری نشست دو دن کی رہی اور اس نشست کے بعد مجھے علم ہوا۔کہ کشمیر کے اصل دشمن بھارتی سیاستدان نہیں۔ ہمارے اپنے لوگ ہیں۔ اپنے لیڈر ہیں۔جن کی خودغرضی کی وجہ سے ہم آج ان حالات سے دوچار ہیں۔میرے دورے کے دوران آزاد کشمیر کا ایک وفد سرکاری فنڈز پر دورے پر تھا۔ جب میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ان کو کیوں دعوت نہیں دی تو موصوف بولے۔ وہ یہاں مسئلہ کشمیر پر بات کرنے نہیں آئے۔وہ سیر و سیاحت کرنے آئے ہیں۔اپنے راجپوت اور جاٹ برادری کے جلسوں میں شرکت کریں گے۔تقریریں کریں گے۔ان کی فوٹو یہاں اور پاکستان کے اخبارات میں جائے گی۔ یہاں چند ہفتے سرسپاٹے کریں گے۔ مقامی لوگوں سے چندہ لے لیں گے اور ہم کشمیریوں کی امداد پر خرچ کررہے ہیں اور سرحدی علاقوں کے متاثرین کو مکانات تعمیر کروا کر دے رہے ہیں۔ بچارے سادہ لوگ مقامی کشمیری باشندے ان کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ جو زیادہ چندہ دے اس کو خصوصی اعزاز دیا جاتا ہے اور ان سے وعدے کیے جاتے ہیں کہ ان کو آئندہ موقع آنے پر تارکینِ وطن کی سیٹ تک دی جاسکتی ہے۔اگر پاکستان جائیں تو ان کو کشمیر ہاؤس پر دعوت دے کر فوٹو لے کر ان کو ٹرخا دیا جاتا ہے۔ ہماری کشمیری کمیونٹی اس لئے مؤثر طریقے سے آواز بلند نہیں کرسکتی۔ کیونکہ ان سادہ لوح لوگوں کو برادریوں اور سیاسی جماعتوں میں تقسیم کر کے لوٹا جارہا ہے۔موصوف نے اس سلسلے میں چند لیڈران کی عیاشیوں کی مثالیں بھی دیں۔جن میں ایک لیڈر کی کلبوں میں عیاشیاں تو پورے برطانیہ کے کشمیری لوگوں کے علم میں ہیں۔جن کے والد نے غریب مزدوروں کے کروڑوں روپے آزاد کشمیر میں ایک بینک کھول کر غبن کیے اور ان کو بتایا گیا کہ سرمایہ کاری میں نقصان کی وجہ سے بینک کو بند کرنا پڑا۔اور خود ان کا بھی ذاتی سرمایہ اس بینک میں ضائع ہوگیا۔مگر سب کو معلوم تھا کہ وہ روپیہ ہضم کر گئے۔کسی نے ان سے نہیں پوچھا۔ وجہ صاف تھی کہ زیادہ تر سرمایہ برطانیہ سے گیا ہوا تھا اور یہ لوگ اپنے کام کاج میں مصروف تھے۔ان کو علم تھا کہ اگر وہ وہاں جا کر کوششیں کریں۔تب بھی ان لوگوں کے وسائل اتنے ہیں کہ وہ انصاف حاصل نہیں کرسکیں گے۔کئی بچارے دیوالیہ ہوگئے۔ کیونکہ انہوں نے ۱۳ فیصد سود پر رقم جمع کروائی تھی۔ان کو علم نہیں تھا کہ یہ رقم ہضم کر لی جائے گی۔مگر اس کے باوجود یہ حضرات دوبارہ آ کر نئے کارکن تیار کر کے جاتے ہیں اور ان سے وصولیاں کرتے ہیں۔جلوس نکال کر تصاویر لیتے ہیں اور پاکستان کے اخبارات میں خوب اشاعت کرواتے ہیں۔ اور لندن میں بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔جس کی وجہ سے ان کا کاروبار چلتا ہے۔کشمیر سے کروڑوں کی رقم سرکاری فنڈز سے لا کر یہاں پر جمع کروا کر جاتے ہیں۔بعض نے مکانات خرید رکھے ہیں۔ چند سالوں میں فروخت کر کے مزید منافع کماتے ہیں۔ گویا یہ لوگ دونوں طرف کے افراد کو لوٹتے ہیں اور یوں ہم کشمیری، آزاد کشمیر کی آبادی کو مسئلہ کشمیر پر دباؤ ڈالنے کے لیے مؤثر طریقے سے آگے نہیں لاسکتے۔ پھر یہاں چند گروپ الحاق پاکستان کے مسلم کانفرنس کے لوگ ہیں۔اور یہ لوگ بھی دوسرے لیڈران کی طرح اپنے ذاتی مفادات کے لیے کام کرتے ہیں۔ان کا منسٹری آف کشمیر آفیسرز کے ساتھ گٹھ جوڑ ہے۔خوب سرکاری فنڈ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ادھر تارکینِ وطن کی سیٹ اور اعزاز مشیر بنا کر لوگوں سے کئی لاکھ پاؤنڈ کا چندہ وصول کر لیتے ہیں۔ پھر چند دوسرے افراد کو امیدوار بنا کر ان سے بھی اسی طرح فنڈز وصول کرتے ہیں۔ راجہ صاحب آپ ناٹنگم شہر میں راجہ اعظم خان صاحب کی دعوت پر چند دن میں جارہے

ہیں۔ان سے ساری صورتحال کا علم ہو جائے گا۔کشمیر ایک پر چون فروشی بن کر رہ گئی ہے۔اس لئے ان لوگوں کے ساتھ بے کار میں تصادم کی پالیسی اپنانے کی بجائے ہم اپنا کام کر رہے ہیں اور جو کچھ ہم سے ہوسکتا ہے۔ وہ کریں گے۔یقیناً اس تنظیم نے یورپ میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر زبردست پروگرام مرتب کیے اور پارلیمنٹ کے ممبران سمیت اہم سیاستدانوں کو مسئلہ کشمیر پر متوجہ کیا۔موصوف اس دنیا میں نہیں رہے۔مگر یہ تنظیم اب بھی یورپ میں موثر آواز بلند کر رہی ہے۔ان میں فہیم کیانی اور محمد غالب اہم شخصیات ہیں۔ جو آجکل انگلینڈ اور یورپ کی تنظیم کی قیادت کر رہے ہیں۔افسوسناک امر یہ ہے کہ ابھی تک آزاد کشمیر میں ان چند خاندانوں کے لوگ ہی سیاست کر رہے ہیں اور دیار غیر سے فنڈز حاصل کرنے اور کشمیر کے نام پر کاروبار کا سلسلہ اسی طرح سرکاری فنڈز سے دوروں پر ضائع کیا جا رہا ہے۔ ۲۰۱۹ء کے لاک ڈاؤن اور بدترین بربریت کے باوجود ان سیاستدانوں کی انسانیت نہیں جاگی۔اور وہ اسی طرح کشمیر کے نام پر دیار غیر میں کاروبار جاری رکھے ہوئے ہیں۔اور آزاد کشمیر کی سیاست میں اپنے خاندان کی گرفت کو مضبوط کرنے کے لئے وفاق سے امداد لے رہے ہیں۔ان کی کرپشن پر کوئی انگلی اٹھانے کو تیار نہیں اور جو انگلی اٹھائیں گے۔ان کی آواز پر کوئی دھیان نہیں دے گا۔بقول سابق صدر آزاد کشمیر یہ وہ کرپٹ لیڈر ہیں۔ جو اپنا حصہ مرکز کے اہم اراکین کو بھی دے دیتے ہیں اور مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔کشمیری مرتے رہیں ان سے ہی تو ان کی سیاست چمکتی ہے اور ان کی دکانداری چلتی ہے۔

ڈاکٹر ایوب ٹھاکر مرحوم کے ساتھ لندن اور پاکستان میں نشست۔

ڈاکٹر ایوب ٹھاکر مرحوم خطہ کشمیر کی ایک مایہ ناز شخصیت تھے۔موصوف کا تحریک آزادی کشمیر پر ایک خاص اصولی موقف تھا اور بہت سے افراد کو ان کے ساتھ نظریاتی اختلافات بھی تھے۔راقم کے ساتھ ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ مانٹریال میں چرار شریف کانفرنس میں ان کو دعوت دی گئی۔تو موصوف تشریف لائے اور راقم کے گھر دعوت میں بھی شرکت کی اور کشمیری اور پاکستانی کمیونٹی کے بیشتر اہم اراکین نے ان سے ملاقات کی۔اس کے بعد جب میں لندن کے دورے پر گیا۔تو موصوف نے فوری طور پر مجھے اپنے دفتر میں دعوت دی۔ مونسل روڈ پر ان کا دفتر دوسری منزل پر تھا۔ان کے چپڑاسی بنگلہ دیشی تھے۔ موصوف مذہبی معاملات میں انتہائی طور پر مذہبی نظریات کے پابند تھے اور مسئلہ کشمیر کا حل کشمیری عوام کی خواہشات پر کرنے کے حق میں تھے۔ان کا کہنا تھا کہ مسئلہ کشمیر کا واحد حل کشمیری عوام کی مرضی پر منحصر ہے اور اکثریت چونکہ مسلمان ہے۔اس لیے اکثریت کا فیصلہ پاکستان کے حق میں بھی ہوسکتا ہے اور ایسی صورت میں کسی بحران سے بچنے کے لیے اقلیتوں کے ساتھ اتحاد اور اتفاق سے آگے بڑھنا ہوگا اور ان کو آئینی اور قانونی تحفظ کے لئے ان کو اعتماد میں لینا ضروری ہوگا۔ کیونکہ ۱۹۴۷ء میں حد سے زیادہ بد اعتمادی کی وجہ سے دونوں طرف کشمیری آبادی والے علاقوں کو اعتماد میں لیے بغیر آگے نہیں بڑھا جا سکتا۔ موصوف کے ساتھ میری برطانیہ میں تین نشستیں ہوئیں اور چند بار سیمیناروں میں بھی مختصر بات چیت ہوتی رہی۔مگر پاکستان میں قیام کے دوران موصوف دو بار مجھے ملنے آئے اور ایک بار راولپنڈی میں ان کی پریس کانفرنس میں شرکت کی۔اس وقت میں برطانیہ سے واپس آیا ہوا تھا اور والدہ محترمہ کے علاج کیلئے اسلام آباد میں میرا قیام تھا۔چنانچہ میری ان سے تفصیلی ملاقات ہوئی۔

ان سے بعض دیگر معاملات پر بھی بات چیت ہوتی رہی۔مگر مندرجہ ذیل معاملات پر ان کے خیالات سے آپ کو آگاہ کرتا ہوں۔

1۔کشمیری لیڈر شپ؟ ان کے خیال میں دونوں طرف کی کشمیری لیڈر شپ کو مرکزی حکومت میں موثر طریقے سے کام نہیں کرنے دیا اور اس کے اثرات سامنے آرہے ہیں۔ان کے خیال میں مقبوضہ کشمیر کی لیڈر شپ اپنے مزاج کے مطابق اپنی سیاست کر رہی ہے۔جن میں بعض لیڈران کرام اپنے خاندان کی مذہبی روایات کے مطابق صرف اپنے خاندان کی سیاسی اور مذہبی حیثیت کو فروغ دینے کے لیے مرکز کے ساتھ روابط بڑھاتے رہے ہیں۔اس سلسلے میں موصوف نے ایک مذہبی گھرانے کا حوالہ دیا۔ جو سعودی عرب میں ان کے قیام کے دوران ایک اجتماع میں شریک ہوئے اور شام کو موصوف سفارتخانے کی دعوت میں شریک ہوئے اور ساری رپورٹ ان کو مہیا کی۔اس سے ان لوگوں کے کردار کے بارے میں ساری صورتحال واضح ہو جاتی ہے۔اس سلسلے میں ان کا کہنا تھا کہ مرکزی حکومت خطہ کشمیر کے خصوصاً وادی کے لیڈران کو جموں اور لداخ کی قیادت کے قریب نہیں جانے دیتی اور اکثر غلط فہمیوں اور ہمارے اپنے لیڈران کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے کشمیر کے ان علاقوں اور وادی کے درمیان دوریاں کی گئیں اور یوں بھارت نے ایک منصوبہ بندی کے تحت لداخ کو الگ اکائی کی صورت میں آگے بڑھا رہا ہے۔اور الزامات عائد کر رہا ہے کہ کشمیری حکومت ان دور دراز علاقوں کو نظر انداز کر رہی ہے۔چنانچہ ایک منصوبہ بندی کے ساتھ ان کو تقسیم کیا گیا اور وادی کے لیڈران کی نقل و حرکت پر مکمل پابندی عائد کر کے ان کو سرینگر کی حد تک محدود کر دیا گیا اور جموں کے علاقوں میں گجر بکروال کا نعرہ لگا کر ان کو اپنا ہمنوا بنانے کی کوششیں کی گئیں۔گویا ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کشمیریوں کو تقسیم در تقسیم سے دوچار کر دیا گیا ہے۔وہ لوگ جو کشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں شریک ہیں۔ان کے خاندانوں کی مالی کفالت کا کوئی انتظام نہیں کیا گیا۔ بے شمار صحافی اور سیاسی کارکن فوجیوں کا نشانہ بنے۔مگر ان کے خاندانوں کی سرپرستی یا مالی امداد کا واضح طریقہ کار نہیں اپنایا گیا۔ انڈین لابی کے لیڈر مکمل طور پر دہلی سرکار کے وفادار بن گئے اور آزاد نمائندوں نے الیکشن کا بائیکاٹ کر کے رہتے راستے بند کر دیئے اور یوں ایک طرف لوگ مرتے رہے۔ دوسری طرف سیاستدان ان کی قبروں کی طرف جلوس نکال کر سیاست کرتے رہے اور بدقسمتی یہ ہوئی کہ جو علاقہ آزاد تھا اور جس کو بیس کیمپ بننا تھا۔ وہ خاندانی وراثت کی جدوجہد میں مصروف ہو گیا اور پاکستان کے جاگیردار طبقہ نے ۱۹۴۷ء سے ہی ان کی کمزوریوں کا فائدہ اٹھایا اور معاہدہ کراچی کر کے آزاد کشمیر کے دو ٹکڑے کر دیئے اور یوں شمالی علاقوں کو بے یار و مددگار چھوڑ دیا گیا اور آزاد کشمیر میں اپنی پسند کی لیڈر پالے گئے۔اور اسلام آباد سے ان کے لیے دولت کے دروازے کھول دیئے گئے۔

راجہ صاحب! آپ دورے میں ساری صورتحال جان چکے ہیں۔ یہ لیڈر غیر ملکی دورے صرف سیاحت، تصویریں کھنچوانے اور سرکاری فنڈز ضائع کرنے اور چندہ اکٹھا کرنے پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔ان کو اس سے غرض نہیں کہ کشمیری مر رہے ہیں۔ وہ ان تصاویر کو دکھا کر کاروبار کرتے ہیں۔آپ نے دیکھا کہ بعض لیڈران مغربی سیاسی رہنماؤں کی تصاویر لگا کر لکھتے ہیں کہ انہوں نے کشمیری عوام کی حمایت کی۔ حالانکہ اکثر ان استقبالیوں میں وہ کشمیر کا ذکر تک نہیں کرتے۔ وہ مقامی ووٹروں کی دعوت پر آتے ہیں اور یہ لوگ ان کے ساتھ گروپ فوٹو لے کر دو چار باتیں کر دیتے ہیں۔بس ان کا کام ہو گیا اور دوروں کے لیے رقم یہاں جمع کروا کے یہاں سے چندے لے جاتے ہیں۔اور بیس کیمپ ایک قسم کا چند خاندانوں کا کاروباری کیمپ بن کر رہ گیا ہے۔

ان کا کہنا تھا کہ پاک بھارت مذاکرات وقت کی اہم ترین ضرورت ہیں۔مگر اس سلسلے میں پاکستان کو

ایک مستحکم سیاسی لیڈرشپ کی ضرورت ہے۔ جو بات کرنے کے قابل ہو۔فلحال ایسی صورتحال نہیں ہے اور بھارت اس سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ چنانچہ میں دیکھ رہا ہوں کہ بھارت اس وقت ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت تقسیمِ کشمیر کی راہ ہموار کرر ہا ہے۔موصوف نے اس سلسلے میں عالمی سطح پر اپنی تنظیم کو وسعت دی۔ امریکہ میں ڈاکٹر غلام نبی فائی اور پاکستان میں جماعت اسلامی سے لے کر پاکستان کے اہم سیاستدانوں سے ان کے قریبی روابط تھے۔مگر قسمت نے ان کی زندگی سے وفا نہ کی اور وہ جلد ہی اس دنیا سے چل بسے۔ مجھے یاد ہے کہ لندن میں قیام کے دوران ایک دن ہم ان کے آفس میں تھے۔میری اہلیہ اور بیٹی بھی ہمراہ تھیں۔ ہم لندن بکنگم پیلس دیکھنے کے لیے جا رہے تھے۔سوچا ان سے ملتے چلیں۔ کچھ دیر ہم ان کے ساتھ رہے۔ نکلتے، نکلتے میری اہلیہ نے ان سے کہا! ڈاکٹر صاحب ذرا رفتار سست کریں۔ یہ نہ ہو کہ آپ اپنی صحت خراب کر بیٹھیں۔ کام ضروری ہے۔مگر صحت بھی ضروری ہے۔موصوف بولے! بہن آپ صحیح کہتی ہیں۔ میرے ڈاکٹر نے کل ہی مجھے یہ مشورہ دیا ہے۔ بلڈ پریشر بہت زیادہ تھا مگر بہن جب اپنے وطن میں ہر روز جنازے اٹھتے دیکھتا ہوں۔تو دل کو سکون نہیں ہوتا اور یوں پھر میں سب کچھ نظر انداز کر کے کام پر لگ جاتا ہوں۔اللہ پاک ان کو جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ایک انتہائی نیک اور محبّ وطن انسان تھے اور کشمیر ہر وقت ان کی زبان پر تھا۔

اس دوران برطانیہ کے مختلف شہروں میں کئی درجن سیاسی شخصیات سے ملنے کا موقع ملا۔جن کو آزاد کشمیر کے لیڈران نے اپنے جال میں پھنسا کر ان کو دیوالیہ پن سے دوچار کیا۔کئی خاندانوں کی زندگیاں تباہ کر دیں۔مگر ان کی صحت پر کچھ اثر نہیں ہوا اور انہوں نے اپنے دوروں میں نئے گاہک تلاش کر کے اپنا وہی وطن فروشی کا کاروبار شروع کیے رکھا۔

نارتھ امریکہ میں کشمیری تنظیموں کی صورتحال کا جائزہ۔

نارتھ امریکہ میں ایک طاقتور لابی کی اس لئے بھی ضرورت ہے کہ امریکہ کو اسلامی دنیا پر مکمل دسترس حاصل ہے اور امریکہ کی اجازت کے بغیر اسلامی دنیا میں کوئی بھی سربراہ کچھ کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔سوائے چند ایک اسلامی ممالک کے جو اپنی قیادت کی وجہ سے آزادانہ پالیسی اختیار کرنے پر تیار ہوئے ہیں۔ان میں ترکی اور ملیشیا واحد دو ملک ہیں۔جنہوں نے کسی ملک کی پرواہ کیے بغیر مسئلہ کشمیر پر کھل کر اظہار خیال ہی نہیں کیا بلکہ سفارتی محاذ پر کھلے عام بھارت کی مذمت کی اور کاروباری تجارت کے باوجود ان دونوں ملکوں نے اپنے معاشی مفادات کی طرف ہرگز توجہ نہیں دی۔اس سلسلے میں ۵ اگست ۲۰۱۹ء میں کشمیر میں لاک بندی کے بعد جن دو ملکوں نے کھل کر پاکستان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے پاکستان سے دس قدم آگے بڑھ کر بھارت کے خلاف موقف اختیار کیا۔ان میں ترکی کے صدر طیب اردگان اور ملائیشیا کے وزیراعظم شامل تھے۔اگر پاکستان کی حکومت اس وقت عالمی دباؤ میں نہ ہوئی اور وزیراعظم عمران خان جنرل اسمبلی میں اور آزاد کشمیر قانون ساز اسمبلی مظفرآباد میں کی گئی تقریر پر اپنے موقف پر کاربند رہتے۔تو کشمیر میں ظلم وستم اور مکمل لاک ڈاؤن میں نرمی آسکتی تھی۔مگر عمران خان آخری وقت میں عالمی دباؤ کا شکار ہو کر ہتھیار ڈال گئے۔ ملائیشیا نے سعودی عرب کے کہنے پر اسلامی کانفرنس میں شرکت نہ کر کے موصوف نے سعودی عرب کے شہزادے سلمان کا ساتھ دیا۔ جو مودی کے قریبی دوست تھے۔ کیونکہ سعودی عرب نے انڈیا میں ۷۰ بلین ڈالر کی سرمایہ کاری کا معاہدہ کیا تھا اور مودی نے سعودی عرب میں شاہ سلمان کی قدم بوسی کر کے سعودی حکمرانوں کو اپنا ہمنوا بنا لیا۔انڈیا میں بابری مسجد کی جگہ رام مندر بنانے اور دہلی میں مسلم کش فسادات اور کشمیر میں قتل وغارت گری کے باوجود سعودی حکمرانوں اور ان کی ناجائز اولاد خلیج کے ریاستوں کے حکمران اور عمران خان نے ایک طرح سے کشمیری علاقوں اور ہندوستان کے مسلمانوں سے غداری کی اور کشمیر کے لئے کھڑے ہوئے مسلمان حکمرانوں پر واضح کر دیا کہ ہم تمہارے ساتھ نہیں۔اور دیگر اسلامی ملکوں نے پاکستان کے رویے پر حیرت کا اظہار کیا۔ پاکستان جیتی ہوئی جنگ ہار چکا تھا اور عالمی سطح پر شدید کوششوں کے بعد بھارت کے خلاف سخت آواز کے باوجود عمران خان نے آخری وقت میں ہتھیار ڈال دیئے۔ پوری قوم کا سرنگوں کر دیا اور بھارت شادیانے بجانے لگا۔

نارتھ امریکہ میں ۱۹۹۰ء کے دوراہے میں۔

۱۹۹۰ء کے دوراہے میں نارتھ امریکہ میں نیویارک میں میرے دوست راجہ حلیم خان ایک سٹار کی صورت میں ابھرے۔موصوف میرے یونیورسٹی کے زمانے کے دوست تھے۔گوارا پلندری سے ان کا تعلق تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی موصوف لبریشن فرنٹ کے ساتھ تھے اور مقبول بٹ کے زبردست حامی تھے اور امان اللہ خان مرحوم کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات تھے۔ اس کے علاوہ نیویارک میں وہ اپنے بھائیوں کی مدد سے اچھا کاروبار بھی چلاتے رہے۔مگر ساتھ ہی ساتھ مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے سلسلے میں جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر مسلسل مظاہروں کے انتظامات کرتے رہے۔ چنانچہ بہت سے کشمیری سیاستدان ان کے گرویدہ ہوگئے ۔ کیونکہ ان کو اب پیسہ کمانے کا نیا راستہ مل گیا تھا۔ چنانچہ سردار قیوم خان، سردار عتیق خان، بیرسٹر سلطان اور کشمیری وزراء کی ایک کھیپ ہر ماہ نیویارک کے چکر لگاتی اور راجہ صاحب ان کی سرپرستی کرتے۔ ان کی ملاقات مقامی سیاستدانوں سے کرواتے۔ کام سارا یہ کرتے رہے اور شہرت کی بلندیوں پر واپس جا کر یہ لیڈر پہنچتے رہے۔ان کو ان دوروں سے دو فوائد حاصل ہوئے۔ایک ان کو فنڈز چوری کرنے کا زیادہ موقع ملا۔ظاہر ہے برطانیہ سے امریکہ فاصلے پر ہے۔اس لیے دگنے فنڈز حاصل کیے اور یہاں تک کہ بعض کشمیری لیڈروں نے یہاں سرمایہ کاری بھی کی اور بعض اپنے ساتھ وفد میں کارکنوں کو یہاں چھوڑ کر چلے جاتے اور یہ کارکن ان کو کما کر روپے بھیجتے۔ایک اطلاع کے مطابق ہر کارکن ۳۰ لاکھ روپے کی رقم کا وعدہ کرتا اور یوں یہ لوگ رات دن کر کے یہ رقوم ادا کرتے اور ان کے کارکن بن کر چندے بھی اکٹھے کرتے رہے۔مگر راجہ حلیم صاحب کا مشن تھا۔اس لیے انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور آج تک وہ اور ان کے بھائی نیویارک مظاہروں میں صفحہ اوّل پر ہوتے ہیں۔اور انہوں نے ہر میدان میں مسئلہ کشمیر پر آواز بلند کی۔ یہ ہمارے کشمیر کے وہ گمنام ہیرو ہیں۔جن کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ان کو کوئی ایواڈ نہیں ملا۔ان پر کسی نے کچھ نہیں لکھا اور وہ سیاسی لیڈر جنہوں نے ان عظیم افراد کو استعمال کر کے کروڑوں کمائے۔انہوں نے کبھی ان کو پاکستان میں بلا کر تصویر تک نہیں کھنچوائی۔ کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ عوام کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ نیویارک میں اتنے بڑے مظاہرے کون کرواتا ہے۔یہ لوگ بڑے ہوٹلوں میں عیاشیاں کرتے رہے اور ان کا یہ بل بھی راقم کی اطلاعات کے مطابق بیچارے مزدور پیشہ افراد چندہ اکٹھا کر کے ادا کرتے رہے۔دوسری اہم شخصیات میں فاروق کاٹھیاواری، ڈاکٹر جی۔این۔میر اور ڈاکٹر غلام نبی فائی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ فائی صاحب کے ساتھ راقم نے بھی ایک دفعہ اٹواہ کے مظاہرے میں شرکت کی جو پارلیمنٹ ہاؤس کی سامنے کیا گیا تھا۔ جو وہاں کے مقامی کشمیری کمیونٹی اور سکھ برادران نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔اس میں مانٹریال سے راقم کے علاوہ جنرل حیات صاحب کے فرزند عمر حیات خان نے بھی یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ڈاکٹر فائی

واشنگٹن میں ایک متحرک شخصیت تھے۔مگر امریکی حکومت کی گرفتاری کے بعد وہ کچھ حد تک بدنام ہو گئے۔ کیونکہ ان پر الزامات تھے کہ انہوں نے پاکستان کی ایجنسیوں سے کئی ملین ڈالر لابی کے لیے وصول کیے تھے۔موصوف نے بعدازاں الزامات تسلیم کرتے ہوئے سزا میں کمی کروائی تھی۔ یہ بات بہرحال سوالیہ نشان ہے کہ آیا موصوف بھی سرکاری سرپرستی میں دکانداری کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کی گرفتاری کے بعد کشمیری کمیونٹی میں ان پر کافی حد تک سوال اٹھائے گئے اور بعض افراد نے ان کے خلاف سخت زبان استعمال کی۔راقم نے اس کے بعد ان سے زیادہ رابطہ نہیں رکھا اور نہ ہی موصوف نے زحمت کی۔اس لیے یہ بات میں کشمیری کمیونٹی پر چھوڑتا ہوں۔

راجہ مظفر صاحب کی آمد۔

راجہ مظفر صاحب جب امریکہ تشریف لائے۔تو وہ اور ان کی اہلیہ مونٹریال تشریف لائے تھے۔ جہاں میرے گھر میں کچھ دیر ٹھہرے اور کھانا ہمارے ساتھ کھایا۔ جموں وکشمیر لبریشن فرنٹ سے ان کا تعلق تھا۔ امریکہ دورے کے دوران موصوف نے مستقل قیام کا منصوبہ بنایا اور امیگریشن حاصل کر لی۔موصوف گذشتہ کئی سالوں سے تحریک آزادی کے سلسلے میں مطالبات اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر میڈیا سمیت ہر سطح پر مؤثر آواز اٹھا رہے ہیں اور مقبوضہ کشمیر تک تحریکِ آزادی کے سلسلے میں روابط رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں اکثر آپ مختلف اخبارات اور فیس بک پر دیکھ سکتے ہیں۔وہ انتہائی جرات مند لیڈر ہیں اور ان کی جدوجہد قابلِ صد ستائش ہے۔موصوف نیویارک آمد پر راجہ حلیم صاحب کے بھی مہمان رہے۔وہ خطہ کشمیر کے ہر فرد سے رابطہ رکھتے ہیں اور مسئلہ کشمیر پر ان کی ایک الگ اور واضح پالیسی ہے۔جس پر موصوف نے کبھی سودا بازی نہیں کی۔ان کے روابط امریکن میڈیا اور سیاستدانوں سے بھی ہیں اور عالمی سطح پر بھی وہ پاکستان اور مقبوضہ کشمیر میں سیاستدانوں سے روابط رکھے ہوئے ہیں۔اس سلسلے میں موصوف کی یہ خوبی ضرور ہے کہ موصوف نے اپنے نظریات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہر سیاستدان کے ساتھ اچھے روابط رکھے اور ان کو مشورہ دیتے رہے اور ان میں سردار قیوم خان اور دوسرے تمام لیڈران شامل ہیں۔ ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں کشمیری لیڈران نے جب دورے کیے۔تو آزاد کشمیر کے وزیراعظم راجہ فاروق حیدر خان ان کے ہاں مہمان رہے اور ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی خاصی تعریف کی اور ان کی کشمیر کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا۔

جاوید راٹھور۔چیئرمین کشمیر سولیڈیٹی کونسل اور تحریک بیداری آزاد جموں وکشمیر

جاوید راٹھور صاحب کا تعلق تحصیل حویلی سے ہے۔موصوف راٹھور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس علاقے کا ایک انتہائی طاقتور قبیلہ رہا ہے۔راٹھور خاندان کی ایک عرصہ تک ابتدائی ادوار میں کشمیر کے کثیر علاقے تک حکومت رہی ہے۔کہوٹہ تحصیل حویلی سے آزادی کی جدوجہد میں اس خاندان نے بڑا کردار ادا کیا ہے اور اس خاندان نے بغیر کسی بیرونی امداد کے اس علاقے سے ڈوگروں کی فوج کو شکست دی۔ راٹھور صاحب سیاست کے میدان میں بھی خاصے متحرک رہے ہیں۔ وزیراعظم ممتاز راٹھور صاحب کی حکومت میں وزیراعظم کے معاون خصوصی رہے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کے قریبی روابط رہے۔بے نظیر بھٹو مرحومہ جب بھی امریکہ تشریف لائیں۔راٹھور صاحب سے رابطہ رکھا اور موصوف نے بھی ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔موصوف جب امریکا تشریف لائے۔تو کاروبار پر توجہ دی۔کیونکہ خاندان کی ذمہ داریاں حائل تھی اور رئیل اسٹیٹ میں نام پیدا کیا۔پھر نارتھ امریکہ میں کشمیری کمیونٹی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے موصوف نے یہ تجویز پیش کی۔ ساری کشمیر کمیٹی حق خودارادیت پر متفق ہو کر آواز اٹھائے تاکہ دیارِ غیر میں جماعتی تقسیم کی وجہ سے کشمیری منتشر نہ ہوں۔گویا ہمارا مطالبہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق رائے شماری سے ہو اور کشمیر کے لوگ جو بھی اکثریتی فیصلہ کریں۔باقی سب اس پر راضی ہو جائیں۔اس سلسلے میں موصوف نے پورے امریکہ میں لاک ڈاؤن کے دوران خاصے کامیاب مظاہرے کروائے۔ٹی۔وی انٹرویو دیئے۔سفارتکاروں اور امریکی کانگریس کے ممبران سے روابط بڑھائے اور مضبوط لابی قائم کی۔ اس کی وجہ سے موصوف کو خاصی شہرت ملی۔راقم نے بھی ان کی تنظیم کے ہیومن رائٹس ونگ کی صدارت قبول کی اور مشترکہ جدوجہد کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔اس کے اثرات یورپ میں بھی پڑے اور بے شمار کشمیری باشندوں نے آزاد کشمیر میں عوام کو بیدار کرنے کے لیے تحریک بیداری کی تنظیم کا سلسلہ شروع کیا ہے۔جس کے روحِ رواں لندن سے جی۔ایس۔قریشی صاحب ہیں۔جنہوں نے اس تحریک کے ذریعے مسئلہ کشمیر اور کشمیر کے دوسرے مسائل کو آئندہ الیکشن میں آگے لانے کا فیصلہ کیا اور میڈیا میں اب یہ تنظیم خاص شہرت حاصل کر چکی ہے۔جاوید راٹھور صاحب نے مختصر عرصے میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے خاصہ اثرات مرتب کیے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں ان کی اس تحریک کے مثبت اثرات پورے آزاد کشمیر میں پڑیں گے۔اس کے ساتھ ہی امریکہ میں کشمیر کے حقوق کے سلسلے میں متفقہ مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ میں کشمیری کمیونٹی یورپین کشمیریوں سے زیادہ متحد ہو کر آگے بڑھے ہیں۔

تصویر لگنی ہے

خواجہ عبدالعمر وانی مرحوم کے آفس ہفت روزہ" کشمیر "فیض آباد مری روڈ راولپنڈی میں۔

۱۹۸۴ء کے دوراہے میں کئی دفعہ ان کے ساتھ نشست ہوئی۔

خواجہ عبدالعمر وانی صاحب ان صحافیوں میں سے ہیں۔جنہوں نے ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کی تاریخی جدوجہد میں حصہ لیا اور چوہدری غلام عباس مرحوم کے ساتھ بھی خاصہ عرصہ گزارا اور آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے اہم رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔مگر وہ اقتدار کی سیڑھیاں نہ چڑھ سکے۔اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ موصوف ایک سچے انسان تھے اور جدوجہد آزادی کے ساتھ ان پر واضح کر دیا کہ ہم تمہارے ساتھ نہیں۔اور دیگر اسلامی ملکوں نے پاکستان کے رویے پر حیرت کا اظہار کیا۔پاکستان جیتی ہوئی جنگ ہار چکا تھا اور عالمی سطح پر شدید کوششوں کے بعد بھارت کے خلاف سخت آواز کے باوجود عمران خان نے آخری وقت میں ہتھیار ڈال دیئے۔پوری قوم کا سر نگوں کر دیا اور بھارت شادیانے بجانے لگا۔

نارتھ امریکہ میں ۱۹۹۰ء کے دوراہے میں۔

۱۹۹۰ء کے دوراہے میں نارتھ امریکہ میں نیویارک میں میرے دوست راجہ حلیم خان ایک سٹار کی صورت میں ابھرے۔موصوف میرے یونیورسٹی کے زمانے کے دوست تھے۔ گوارا پلندری سے ان کا تعلق تھا۔ طالب علمی کے زمانے سے ہی موصوف لبریشن فرنٹ کے ساتھ تھے اور مقبول بٹ کے زبردست حامی تھے اور امان اللہ خان مرحوم کے ساتھ ان کے قریبی تعلقات تھے۔اس کے علاوہ نیویارک میں وہ اپنے بھائیوں کی مدد سے اچھا کاروبار بھی چلاتے رہے۔مگر ساتھ ہی ساتھ مقبوضہ کشمیر کی آزادی کے سلسلے میں جنرل اسمبلی کے اجلاس کے موقع پر مسلسل مظاہروں کے انتظامات کرتے رہے۔چنانچہ بہت سے کشمیری سیاستدان ان کے گرویدہ ہو گئے۔کیونکہ ان کو اب پیسہ کمانے کا نیا راستہ مل گیا تھا۔چنانچہ سردار قیوم خان، سردار عتیق خان، بیرسٹر سلطان اور کشمیری وزراء کی ایک کھیپ ہر ماہ نیویارک کے چکر لگاتی اور راجہ صاحب

ان کی سرپرستی کرتے۔ ان کی ملاقات مقامی سیاستدانوں سے کرواتے۔ کام سارا یہ کرتے رہے اور شہرت کی بلندیوں پر واپس جا کر یہ لیڈر پہنچتے رہے۔ ان کو ان دوروں سے دو فوائد حاصل ہوئے۔ ایک ان کو فنڈز چوری کرنے کا زیادہ موقع ملا۔ ظاہر ہے برطانیہ سے امریکہ فاصلے پر ہے ہے۔ اس لیے دگنے فنڈز حاصل کیے اور یہاں تک کہ بعض کشمیری لیڈروں نے یہاں سرمایہ کاری بھی کی اور بعض اپنے ساتھ وفد میں کارکنوں کو یہاں چھوڑ کر چلے جاتے اور یہ کارکن ان کو کما کر روپے بھیجتے۔ ایک اطلاع کے مطابق ہر کارکن ۳۰ لاکھ روپے کی رقم کا وعدہ کرتا اور یوں یہ لوگ رات دن کر کے یہ رقوم ادا کرتے اور ان کے کارکن بن کر چندے بھی اکٹھے کرتے رہے۔ مگر راجہ حلیم صاحب کا مشن تھا۔ اس لیے انہوں نے اس کی پرواہ نہیں کی اور آج تک وہ اور ان کے بھائی نیویارک مظاہروں میں صفحہ اوّل پر ہوتے ہیں۔ اور انہوں نے ہر میدان میں مسئلہ کشمیر پر آواز بلند کی۔ یہ ہمارے کشمیر کے وہ گمنام ہیرو ہیں۔ جن کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی۔ ان کو کوئی ایوارڈ نہیں ملا۔ ان پر کسی نے کچھ نہیں لکھا اور وہ سیاسی لیڈر جنہوں نے ان عظیم افراد کو استعمال کر کے کروڑوں کمائے۔ انہوں نے کبھی ان کو پاکستان میں بلا کر تصویر تک نہیں کھینچوائی۔

کیونکہ وہ چاہتے تھے کہ عوام کو یہ معلوم ہی نہ ہو کہ نیویارک میں اتنے بڑے مظاہرے کون کرواتا ہے۔ یہ لوگ بڑے ہوٹلوں میں عیاشیاں کرتے رہے اور ان کا یہ بل بھی راقم کی اطلاعات کے مطابق بیچارے مزدور پیشہ افراد چندہ اکٹھا کر کے ادا کرتے رہے۔ دوسری اہم شخصیات میں فاروق کاٹھیاواری، ڈاکٹر جی۔ این۔ میر اور ڈاکٹر غلام نبی فائی کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ فائی صاحب کے ساتھ راقم نے بھی ایک دفعہ اٹاوہ کے مظاہرے میں شرکت کی جو پارلیمنٹ ہاؤس کی سامنے کیا گیا تھا۔ جو وہاں کے مقامی کشمیری کمیونٹی اور سکھ برادران نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔ اس میں مانٹریال سے راقم کے علاوہ جنرل حیات صاحب کے فرزند عمر حیات خان نے بھی یونیورسٹی کے دوستوں کے ساتھ شرکت کی تھی۔ ڈاکٹر فائی واشنگٹن میں ایک متحرک شخصیت تھے۔ مگر امریکی حکومت کی گرفتاری کے بعد وہ کچھ حد تک بدنام ہو گئے۔

کیونکہ ان پر الزامات تھے کہ انہوں نے پاکستان کی ایجنسیوں سے کئی ملین ڈالر لابی کے لیے وصول کیے تھے۔ موصوف نے بعد ازاں الزامات تسلیم کرتے ہوئے سزا میں کمی کروائی تھی۔ یہ بات بہر حال سوالیہ نشان ہے کہ آیا موصوف بھی سرکاری سرپرستی میں دکانداری کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کی گرفتاری کے بعد کشمیری کمیونٹی میں ان پر کافی حد تک سوال اٹھائے گئے اور بعض افراد نے ان کے خلاف سخت زبان استعمال کی۔ راقم نے اس کے بعد ان سے زیادہ رابطہ نہیں رکھا اور نہ ہی موصوف نے زحمت کی۔ اس لیے یہ بات میں کشمیری کمیونٹی پر چھوڑتا ہوں۔

راجہ مظفر صاحب کی آمد۔

راجہ مظفر صاحب جب امریکہ تشریف لائے۔ تو وہ اور ان کی اہلیہ مونٹریال تشریف لائے تھے۔ جہاں میرے گھر میں کچھ دیر ٹھہرے اور کھانا ہمارے ساتھ کھایا۔ جموں و کشمیر لبریشن فرنٹ سے ان کا تعلق تھا۔ امریکہ دورے کے دوران موصوف نے مستقل قیام کا منصوبہ بنایا اور امیگریشن حاصل کر لی۔ موصوف گذشتہ کئی سالوں سے تحریک آزادی کے سلسلے میں مطالبات اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں پر میڈیا سمیت ہر سطح پر مؤثر آواز اٹھا رہے ہیں اور مقبوضہ کشمیر تک تحریکِ آزادی کے سلسلے میں روابط رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں اکثر آپ مختلف اخبارات اور فیس بک پر دیکھ سکتے ہیں۔ وہ انتہائی جرات مند لیڈر ہیں اور ان کی جدوجہد قابلِ صد ستائش ہے۔ موصوف نیویارک آمد پر راجہ حلیم صاحب کے بھی مہمان رہے۔ وہ خطہ کشمیر کے ہر فرد سے رابطہ رکھتے ہیں اور مسئلہ کشمیر پر ان کی ایک الگ اور واضح پالیسی ہے۔ جس پر موصوف نے کبھی سودا بازی نہیں کی۔ ان کے روابط امریکن میڈیا اور سیاستدانوں سے بھی ہیں اور عالمی سطح پر بھی وہ پاکستان اور مقبوضہ کشمیر میں سیاستدانوں سے روابط رکھے ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں موصوف کی یہ خوبی ضرور ہے کہ موصوف نے اپنے نظریات کو ایک طرف رکھتے ہوئے ہر سیاستدان کے ساتھ اچھے روابط رکھے اور ان کو مشورہ دیتے رہے اور ان میں سردار قیوم خان اور دوسرے تمام لیڈران شامل ہیں۔ ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں کشمیری لیڈران نے جب دورے کیے۔ تو آزاد کشمیر کے وزیر اعظم راجہ فاروق حیدر خان ان کے ہاں مہمان رہے اور ان کا شکریہ ادا کیا اور ان کی خاصی تعریف کی اور ان کی کشمیر کی جدوجہد کو خراج تحسین پیش کیا۔

جاوید راٹھور۔ چیئرمین کشمیر سولیڈیٹی کونسل اور تحریک بیداری آزاد جموں و کشمیر

جاوید راٹھور صاحب کا تعلق تحصیل حویلی سے ہے۔ موصوف راٹھور خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ جو اس علاقے کا ایک انتہائی طاقتور قبیلہ رہا ہے۔ راٹھور خاندان کی ایک عرصہ تک ابتدائی ادوار میں کشمیر کے کثیر علاقے تک حکومت رہی ہے۔ کہوٹہ تحصیل حویلی سے آزادی کی جدوجہد میں اس خاندان نے بڑا کردار ادا کیا ہے اور اس خاندان نے بغیر کسی بیرونی امداد کے اس علاقے سے ڈوگروں کی فوج کو شکست دی۔ راٹھور صاحب سیاست کے میدان میں بھی خاصے متحرک رہے ہیں۔ وزیر اعظم ممتاز راٹھور صاحب کی حکومت میں وزیر اعظم کے معاون خصوصی رہے اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کے قریبی روابط رہے۔ بے نظیر بھٹو مرحومہ جب بھی امریکہ تشریف لائیں۔ راٹھور صاحب سے رابطہ رکھا اور موصوف نے بھی ان کی خاطر تواضع میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ موصوف جب امریکا تشریف لائے۔ تو کاروبار پر توجہ دی۔ کیونکہ خاندان کی ذمہ داریاں حائل تھی اور رئیل اسٹیٹ میں نام پیدا کیا۔ پھر نارتھ امریکہ میں کشمیری کمیونٹی کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کے لئے موصوف نے یہ تجویز پیش کی۔ ساری کشمیر کمیٹی حق خود ارادیت پر متفق ہو کر آواز اٹھائے تا کہ دیارِ غیر میں جماعتی تقسیم کی وجہ سے کشمیری منتشر نہ ہوں۔ گویا ہمارا مطالبہ اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق رائے شماری سے ہو اور کشمیر کے لوگ جو بھی اکثریتی فیصلہ کریں۔ باقی سب اس پر راضی ہو جائیں۔ اس سلسلے میں موصوف نے پورے امریکہ میں لاک ڈاؤن کے دوران خاصے کامیاب مظاہرے کروائے۔ ٹی۔ وی انٹرویو دیئے۔ سفارتکاروں اور امریکی کانگریس کے ممبران سے روابط بڑھائے اور مضبوط لابی قائم کی۔ اس کی وجہ سے موصوف کو خاصی شہرت ملی۔ راقم نے بھی ان کی تنظیم کے ہیومن رائٹس ونگ کی صدارت قبول کی اور مشترکہ جدوجہد کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ اس کے اثرات یورپ میں بھی پڑے اور بے شمار کشمیری باشندوں نے آزاد کشمیر میں عوام کو بیدار کرنے کے لیے تحریک بیداری کی تنظیم کا سلسلہ شروع کیا ہے۔ جس کے روح رواں لندن سے جی۔ ایس۔ قریشی صاحب ہیں۔ جنہوں نے اس تحریک کے ذریعے مسئلہ کشمیر اور کشمیر کے دوسرے مسائل کو آئندہ الیکشن میں آگے لانے کا فیصلہ کیا اور میڈیا میں اب یہ تنظیم خاص شہرت حاصل کر چکی ہے۔ جاوید راٹھور صاحب نے مختصر عرصے میں اپنی قائدانہ صلاحیتوں سے خاصہ اثرات مرتب کیے ہیں اور امید کی جاتی ہے کہ مستقبل میں ان کی اس تحریک کے مثبت اثرات پورے آزاد کشمیر میں پڑیں گے۔ اس کے ساتھ ہی امریکہ میں کشمیر کے حقوق کے سلسلے میں متفقہ مظاہروں کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ امریکہ میں کشمیری کمیونٹی یورپین کشمیریوں سے زیادہ متحد ہو کر آگے بڑھے ہیں۔

تصویر

خواجہ عبدالعمر وانی مرحوم کے آفس ہفت روزہ" کشمیر "فیض آباد مری روڈ راولپنڈی میں۔
۱۹۸۴ء کے دوراہے میں کئی دفعہ ان کے ساتھ نشست ہوئی۔

خواجہ عبدالعمر وانی صاحب ان صحافیوں میں سے ہیں۔ جنہوں نے ۱۹۴۷ء اور اس کے بعد کی تاریخی جدوجہد میں حصہ لیا اور چوہدری غلام عباس مرحوم کے ساتھ بھی خاصہ عرصہ گزارا اور آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس کے اہم رہنماؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ مگر وہ اقتدار کی سیڑھیاں نہ چڑھ سکے۔ اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ موصوف ایک سچے انسان تھے اور جدوجہد آزادی کے ساتھ ان کو دلی لگاؤ تھا۔ وہ اکثر ہفت ِ روزہ کشمیر' میں لکھا کرتے تھے۔ اور کینیڈا آمد کے بعد جب میں نے اپنا وطن کینیڈا کے ایڈیٹر کی حیثیت سے اور انسانی حقوق کے ادارے کے ساتھ کام شروع کیا اور پاکستان کے بیشتر اخبارات میں کالم لکھنے شروع کئے۔ جن میں روزنامہ نوائے وقت میں راقم کا ایک کالم 'مکتوب کینیڈا' خاصا مشہور ہوا۔ راقم نے ان کے ہفت روزہ میں ایک دفعہ امیر شریعت مولانا عبداللہ کفل گڑھوی شیر پونچھ کے بارے میں آرٹیکل لکھا۔ موصوف نے اسے شائع تو کر دیا۔ مگر بعدازاں پتہ چلا کہ مسلم کانفرنس کی اعلی لیڈرشپ کو یہ مضمون پسند نہیں آیا۔ کیونکہ وہ جدوجہد آزادی کی الگ تاریخ رقم کرر ہے تھے۔ جس میں کوئی سابقہ لیڈر شامل نہ ہو۔ موصوف کے کہنے پر میں نے دیارِ غیر میں کشمیری رہنماؤں کے دوروں اور کشمیری تنظیموں کی جدوجہد کے بارے میں مضامین لکھنے شروع کیے۔ تو موصوف نے شکایات کے باوجود میرے مضامین کو شائع کیا اور ہر ماہ ہفت روزہ" کشمیر "ایک پیکج کی صورت میں کینیڈا بھیجتے رہے تھے اور اکثر چند تجاویز بھی دیتے تھے اور بعض معاملات میں اختلافات کا اظہار بھی کرتے تھے۔ موصوف الحاق پاکستان کے زبردست حامی تھے۔ مگر مسئلہ کشمیر پر حق خودارادیت اور اقوام متحدہ کی قراردادوں کے بغیر کوئی بھی حل قابل قبول نہ ہوگا۔ بلکہ موصوف کا کہنا تھا کہ مسئلہ کشمیر کے حل کے بغیر کوئی بھی معاہدہ بھارت کے ساتھ نہیں کیا جانا چاہیئے۔ اکثر کشمیری لیڈران کے بارے میں میری رپورٹوں پر شکریہ کا اظہار کرتے رہے۔ ۱۹۹۰ء کے دور میں مسلم کانفرنس بحران سے دوچار ہوئی۔ جب سردار عبدالقیوم صاحب نے اپنے بیٹے کے لیے راستہ صاف کرنے کے لیے موصوف نے سردار سکندر حیات خان اور راجہ فاروق حیدر خان کا پتا کاٹ کر سردار عتیق صاحب کے لئے راستہ ہموار کیا۔ موصوف کا کہنا تھا۔ اب بیس کیمپ ایک اقتدار کی جنگ ہے۔ جب یورپ کے دورے کے دوران راقم نے کشمیر لیڈروں کی عیاشیوں اور بے جا اخراجات پر کالم لکھے۔ تو موصوف نے شکریہ ادا کیا کہ یہاں تو الٹی گنگا بہتی ہے۔ چنانچہ ان کی اپنی جماعت نے " کشمیر " کے ہفت روزہ کو ختم کروانے کے لیے اپنا ہفت روزہ جاری کروایا تا کہ ان کو نقصان پہنچایا جا سکے۔ مگر موصوف نے اس کی پرواہ نہ کی اور کھلے عام ایک نڈر صحافی کی طرح کشمیری لیڈران کو بے نقاب کرنے والے مضامین شائع کرتے رہے۔ موصوف سردار سکندر حیات کی حکومت کے دوران سینئر مشیر رہے۔ موصوف کی عزت افزائی کرنے والوں میں سردار سکندر حیات خان صاحب اور راجہ فاروق حیدر صاحب شامل رہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب مسلم کانفرنس میں شدید اختلافات کا سلسلہ چل رہا تھا۔ تو اسلام آباد کلب میں سید بشیر حسین جعفری مرحوم اور راجہ یسین صاحب آف جگلڑی نے میرے لیے ایک دعوتی پروگرام کیا۔ جس میں کافی حضرات شریک تھے۔ جعفری صاحب نے کہا کہ راجہ صاحب مجھ سے درخواست کی گئی ہے کہ کسی طرح وانی صاحب کو بھی بلائیں۔ مگر میں ان کو ایسا نہیں کہہ سکتا۔ آپ مہمان ہیں۔ ان کو کہیں۔ میں نے ان سے رابطہ قائم کیا اور کہا! وانی صاحب آپ تشریف لے آئیں۔ آپ کے بعض ساتھی بھی ہیں۔ گپ شپ ہو جائے گی۔ موصوف کہنے لگے۔ راجہ صاحب آپ چند ہفتے یہاں لگائیں۔ سب سے ملاقات کریں۔ سیاسی صورتحال کا جائزہ لیں۔ آپ انسانی حقوق کی تنظیم کے سربراہ ہیں۔ آپ کو صورتحال کا ادراک ہونا چاہیئے۔ یہاں پر ہمارے کشمیری بھائی کیا کرر ہے ہیں اور میں اس قسم کے اجتماعات میں شرکت نہیں کرتا۔ معذرت خواہ ہوں۔ ہاں! آپ روانگی سے قبل چائے کے کپ پر ہوٹل میں بلائیں گے۔ تو میں آ جاؤں گا۔ میں نے ان سے معذرت کی۔ کہنے لگے، راجہ صاحب یہاں کشمیر کے نام پر تجارت ہو رہی ہے اور اس کا دائرہ کار اب یورپ اور نارتھ امریکہ تک پھیل گیا ہے۔ مسئلہ کشمیر تو دور کی بات ہے۔ یہ مقامی لوگوں کا حق مار کر اپنے گھر بھرنے کی دوڑ میں ہیں۔ آپ کو ظاہر ہے دعوت دیں گے۔ ان کو شہرت کی ضرورت ہے۔ ورنہ بغیر مقصد کے لیے اپنے خاندان کو بھی لات مار کر دور کر دیں گے۔ کشمیری دونوں طرف سے سیز فائر لائن پر اور کشمیر کے اندر اپنی جانے دے رہے ہیں۔ مگر ہمارے ان کشمیری لیڈران کو اپنی دکانداری کی پڑی ہے اور کشمیر کے نام پر آدھے سے زیادہ بجٹ اپنی اولاد کے لئے سرمایہ اکٹھا کرنے پر ضائع کر رہے ہیں۔ آپ نے جو مضامین بھیجے ہیں۔ ان کو شائع کرنے پر بہت سے لیڈر غصے میں ہیں۔ باغ کی طرف جانا ہو تو احتیاط رکھیں۔ اللہ تعالی ان کو جنت الفردوس میں جگہ دیں۔ موصوف واقعی پاکستان اور کشمیر سے محبت کرنے والے رہنما تھے۔

۲۶۴ تک

283

تصویر

۱۹۹۰ء کے دوران آٹاوا میں ایک مظاہرے میں کشمیر اور پاکستانی کمیونٹی کے علاوہ لاتعداد سکھوں نے بھی شرکت کی۔ یہ مظاہرہ مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور بھارت کی لگاتار زیادتیوں کے خلاف ساؤتھ ایشن کمیونٹی کے افراد کی طرف سے کیا گیا تھا۔ اس میں واشنگٹن سے ڈاکٹر غلام نبی فائی اور چند دیگر افراد بھی تشریف لائے تھے۔ مظاہرین سے راقم کے علاوہ ڈاکٹر فائی صاحب اور دیگر مقررین نے بھی خطاب کیا تھا۔ اجتماع کے بعد میرے چند ساتھیوں نے ایک وفد کی صورت میں آٹاوا کے تین سفیروں سے ملاقات کی۔ جن میں سعودی عرب، پاکستان اور ترکی کے سفیر بھی تھے۔ ان کو ایک یادداشت پیش کی گئی۔ سعودی سفیر نے کھلے عام کہہ دیا کہ جناب پاکستان اگر میدان میں آئے۔ تو ہم مدد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ مگر پاکستان کو تیار نہ ہو تو ہم اس پوزیشن میں نہیں کہ انڈیا پر کسی قسم کا دباؤ ڈال سکیں۔ وجہ یہ ہے کہ ہماری انڈیا کے ساتھ تجارت ہے اور ہر ملک کو اپنے تجارتی مفادات کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں مجھے یاد ہے کہ ترکی کے سفیر نے جن کا نام یاد نہیں آ رہا۔ ایک بڑے مزے کی بات کہی۔ ڈاکٹر مطلوب حسین مرحوم اس وفد میں شامل تھے۔ انہوں نے ترکی کے سفیر کو ہماری طرف سے ایک خط اس وقت کے صدر کے نام دیا اور کہا! سر یہ خط آپ صدر محترم کو بھیج دیں۔ وہ مسکرایا اور کہا! کہ ڈاکٹر مطلوب میں یہ تو بھیج دوں گا مگر یہ خط لکھنے اور مظاہرہ کرنے سے انڈیا تو کبھی نہیں مانے گا اور نہ ہی بیانات سے کشمیر سے انڈیا بھاگے گا۔ انڈیا کو کشمیر سے نکلنے کے لیے تیار کرنا ہوگا اور اور انڈیا اس وقت تیار ہوگا۔ جب اس کو کشمیر میں بھاری جانی اور مالی نقصان کا سامنا کرنا پڑے گا۔ آپ بے شک دنیا بھر کے لیڈروں کو خط لکھیں۔ مظاہرہ کریں۔ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ انڈیا کو جب تک کشمیر معاشی بوجھ نظر نہیں آئے گا۔ وہ

کشمیر سے نہیں بھاگے گا۔ اس لیے ڈاکٹر مطلوب صاحب آپ اور آپ کے ساتھی جو ہیومن رائٹس کے چیئر مین ہیں۔ دونوں مل کر حکومت پاکستان کو سمجھائیں کہ وہ کشمیریوں کی مدد کریں۔ ان کو اکیلا نہیں چھوڑیں۔ پھر موصوف نے کشمیر پر ایک فائل نکالی۔ میرا نام پوچھا اور کہا کہ آپ کے جملہ خطوط جو آپ نے ہمارے سفارتخانے کو لکھے وہ فائل میں موجود ہیں۔ ہم اکثر کینیڈین حکومت کو اپنی رائے دے دیتے ہیں۔ جب کبھی ہمیں اپنے مسائل اور تجارتی پروگرام پر بات کرنے کے لیے وزیراعظم سے ملنا ہوتا ہے۔ مگر مسئلے کا حل پاکستان اور بھارت کے پاس ہے۔ پھر موصوف نے پورے وفد کو کھانے کی دعوت دی اور ہم کافی دیر ان کے ساتھ رہے۔ جب فارغ ہوئے تو ڈاکٹر مطلوب حسین صاحب کہنے لگے۔ راجہ صاحب آٹاوہ کا دیدار ہو گیا۔ سفیر نے بڑے مزے کی بات کی ہے۔ ہم خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ خود جان نہ ہو اور بھارت کی زیادتیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے پاکستان کے حکمران تیار نہ ہوں تو بے سروسامانی کا عالم میں نعرے بازی سے ہم اپنے ہی بھائیوں کو قتل کروائیں گے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بہہ نکلے۔ سارے دوست کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر ہم نے ماحول کو بدلنے کے لیے ان کا شکریہ ادا کیا اور کہا! کہ جناب آپ سب نے ایک مظاہرے میں شرکت کر کے اپنا فرض ادا کیا ہے۔ اللہ پاک آپ کو جزا دے اور یوں ہمارا پروگرام اختتام کو پہنچا۔ اس دوران ہم نے چند ممبران پارلیمنٹ سے بھی ملاقات کی۔ جو پہلے سے ہم نے ملاقات کا وقت لیا ہوا تھا۔ ان سب حضرات نے مسئلہ کشمیر پر کشمیریوں کی حمایت پر کھل کر اظہار خیال کیا اور وزیراعظم سمیت تمام افراد اور اہم اداروں کو خط لکھنے کا وعدہ کیا۔ اس قسم کے مظاہرے آئے روز پوری دنیا میں ہو رہے ہیں۔ مگر افسوس کہ پاکستان کی نااہل قیادت اس عالمی ردعمل کو کشمیریوں کے حق میں کیش نہ کروا سکی۔

287

تصویر

مانٹریال میں کشمیر اور برصغیر کی صورتحال پر ایک سیمینار میں اس وقت کی پریوی کونسل کے صدر اور لبرل پارٹی آف کینیڈا کے لیڈر مسٹر سٹیفن ڈیان۔ ساؤتھ ایشین سینٹر کے ڈائریکٹر بشیر حسین اور راجہ محمد حبیب جالب چیئرمین جموں و کشمیر ہیومن رائٹس کونسل انٹرنیشنل ونگ اجتماع کے اختتام پر میڈیا اے۔ ایف۔ پی کے نمائندے کی طرف سے فوٹو لینے کے دوران حال میں کھڑے ہیں۔

کشمیر میں انسانیت سوز جرائم کب ختم ہوں گے

گزشتہ ۷۳ سالوں میں خطہ کشمیر جہنم کا نمونہ بنا ہوا ہے۔ ہر روز بے گناہ لوگ مر رہے ہیں اور انسانیت اسی ظلم و ستم کو برداشت کر رہی ہے۔ کیونکہ عالمی طاقتوں کو پاکستان اور انڈیا دونوں کو اسلحہ فروخت کرنا ہے اور غربت اور بے چارگی کے شکار لوگ سیاستدانوں کی چالاکیوں اور کشمیر کے نام پر لوگوں کو بیوقوف بنانے کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلا ہے اور دونوں ملکوں کی اس سیاست میں کشمیر کے لوگ ظلم و ستم کی چکی میں پس رہے ہیں۔ ۳۰ اگست ہر سال ان علاقوں کے گمشدہ شہریوں Victim of enforced disappearances کا دن اقوام متحدہ کے ادارے کے ذریعے بنایا جاتا ہے۔ اس سلسلہ زبردستی غائب کئے جانے والے شہریوں کا یہ دن اس لیے بتایا جاتا ہے۔ کیونکہ ان شہریوں کو ان کی مرضی کے خلاف زبردستی اغوا کیا جاتا ہے۔ ان کو زیر حراست لیا جاتا ہے اور یہ کام کرنے والے ریاست کے سرکاری ادارے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان افراد کو اٹھانے کے بعد ان کو نامعلوم مقامات پر منتقل کر دیا جاتا ہے اور ان کے بارے میں سرکاری اہلکار کسی بھی قسم کی اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان افراد کو غائب کرنے کے بعد ان کو ٹارچر سیلز (Torture cell) میں رکھا جاتا ہے۔ جہاں ان کو کسی بھی قسم کا دفاع کرنے کی قانونی سہولت نہیں ہوتی۔ گویا یہ لوگ ان ایجنسیوں کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ وہ ان کو ہلاک کر کے قبریں کھود کے دفن کر سکتے ہیں۔ جیسا کہ اکثر کشمیر میں ہو رہا ہے اور یہ سلسلہ ۱۹۹۰ء سے جاری ہے۔ چناچہ اقوام متحدہ کے ادارے کی رپورٹ کے مطابق (۲۰۰۹۔۱۹۸۹) میں گمشدہ افراد کے والدین کو Association of parents of disappeared person (APDP) کے مطابق آٹھ ہزار کیسز سامنے آئے ہی۔ جہاں ان افراد کے والدین اور رشتہ دار کوششوں کے باوجود ان افراد کو برآمد نہیں کروا سکے اور نہ ہی ان کے بارے میں کوئی پتہ چل سکا کہ وہ کہاں ہیں۔ یا آیا وہ زندہ بھی ہیں کہ نہیں۔ مگر حکومت انڈیا اکثر ان گمشدہ افراد کی تعداد بہت کم بتاتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اقوام متحدہ کے انسانی حقوق کے ادارہ کے ہائی کمیشنز OHCHR کی ۲۰۱۸ء کی رپورٹ کے مطابق آٹھ ہزار افراد کی مکمل طور پر رپورٹ گمشدہ افراد ہے۔ مگر حکومت انڈیا نے ان رپورٹوں کو مسترد کر دیا۔ سویلین باشندوں کو سرعام فوج اور پولس اور ایجنسیوں کے ذریعے اٹھانے کا کام ایک جنگی ہتھیار ہے۔ جس کے ذریعے حکومتیں مقامی افراد کو خوف و ہراس کا شکار کر کے ان کو خاموش کرنے کی کوششیں کرتے ہیں اور یہ ان لوگوں کے خلاف استعمال کیا جاتا ہے۔ جو ریاستی کاروائیوں کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں اور جدوجہد کرتے ہیں اور یہ ہتھیار بہت سے ممالک میں استعمال میں لایا جاتا ہے۔ جہاں حکومت اپنے مخالفین کو اس طرح گھروں سے اٹھا کر غائب کر دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں جموں و کشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (JKCCS) نے حکومت کی طرف سے زبردستی اغوا کیے گئے۔ شہریوں کے بارے میں خاصی تفصیل سے رپورٹ مرتب کی ہے اور اس سلسلے میں پوری نشاندہی کی ہے اور ان کے نام، ایڈریس اور خاندان کی بھی مکمل شناخت کی ہے۔ مگر اس سلسلے میں غریب والدین کے لئے قانونی چارہ جوئی سے ان افراد کو واپس لانا آسان کام نہیں ہے۔ اس سلسلے میں صرف پولیس رپورٹ درج کروائی جا سکتی ہے۔ جب کسی فرد کو راستے سے ہی اٹھا لیا جائے۔ تو خاندان والوں کے لئے یہ جاننا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان کو ایجنسیوں نے اغوا کیا ہے یا کوئی اور اٹھا کر لے گیا ہے۔ اس سلسلے میں یونین میں جرم تو صاف طور پر اغوا یا غیر قانونی قید کی صورت میں ہوتا ہے۔ مگر جب فوج اور ایجنسیوں کو آئینی تحفظ فراہم کر دیا جائے۔ تو ایسے حالات میں انصاف حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے برابر ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مقبوضہ کشمیر میں Armed forces special power Act of 1990, the Disturbed areas and and Jammu and Kashmir public safety Act 1978 Act 1976 the unlawful activities (prevention) Act of 1967 کے تحت انڈین آرمی کو ان قوانین کے ذریعے اپنے کام کے دوران ان قوانین کے تحت کسی بھی شخص کو اٹھانے، گرفتار کرنے اور غائب کرنے کے معاملے میں کسی بھی قسم کا سوال نہیں کیا جا سکتا۔ گویا ان کو ماورائے عدالت اختیارات حاصل ہیں۔ اس لیے وہ کشمیر میں ہر طرح کی بربریت اختیار کرنے میں آزاد ہیں اور اس سلسلے میں ان کو کوئی بھی عدالت نہ گرفتار کر سکتی ہے۔ نہ ہی ان کے خلاف کارروائی کر سکتی ہے۔ چنانچہ ۲۰۰۹ء میں International People's Tribunal on Human Rights and justice Of Indian administered Kashmir نے مقبوضہ کشمیر کے بانڈی پورہ، بارفولا اور بانڈی

پورہ کھواڑہ ڈسٹرکٹ میں ۲۷۰۰ ایسی قبریں ملیں جن کی تحقیقات کروائی گئیں اور جموں وکشمیر یونین رائٹس کمیشن نے اسپیشل انویسٹیگیشن (SIT) کے قبروں کو کھودا تو ۲۷۳۰ انسانی لاشیں ملیں۔ جو ۳۷ مختلف علاقوں میں پائی گئیں اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان لوگوں کو فوج اور فوج کے زیر کنٹرول اداروں نے قتل کر کے دفن کیا اور ان میں سویلین یا آزادی کے لیے جدو جہد کرنے والے کشمیری بھی ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں ساری رپورٹوں کے باوجود انڈین حکومت نے نہ کسی فوجی آفیسر کو عدالت میں پیش ہونے کے لیے تیار کیا۔ نہ ہی اس معاملے میں کسی قسم کی جوابدہی کو ضروری سمجھا اور اقوام متحدہ کے ادارے کی ان رپورٹوں کے باوجود عالمی ادارہ کوئی اقدام کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ وجہ صاف ظاہر تھی کہ ان سارے غیر قانونی اور جنگی جرائم کے باوجود پاکستان کے حکمران عالمی سطح پر کوئی مؤثر کردار ادا نہیں کر سکے۔ کیونکہ پاکستان میں اکثر حکمران غیر آئینی طریقے سے اقتدار میں آتے رہے اور اپنے اقتدار کو بحال رکھنے اور قانونی پوزیشن قائم رکھنے کے لیے ان کو امریکہ کی ضرورت تھی اور امریکہ نے بھارتی سفارتی دباؤ کے تحت ان ڈیکیٹروں کو مجبور کیا کہ وہ بھارت سے پرامن مذاکرات پر توجہ دیں اور یہ حکمران کیونکہ ڈکٹیٹر تھے اور ان کو امریکی حکومت کی حمایت کی ضرورت تھی۔ اس لئے یہ لیڈر بھارت کے اشاروں پر ناچتے رہے اور بھارت دوسری طرف قتل وغارت گری کا سلسلہ جاری رکھنے اور عالمی طور پر پورے کشمیر کو قید خانہ بنانے میں کامیاب ہو گیا اور پاکستان سمیت ہمارے کشمیری لیڈر انڈیا کے وزیر اعظم نریندر مودی کے کشمیر کے بارے میں خطرناک پلان کو سمجھنے میں ناکام رہے۔ اس سلسلے میں مقبوضہ کشمیر کی لیڈر شپ کو مکمل طور پر سری نگر شہر تک محدود کر دیا گیا۔ ہمارے مقبوضہ کشمیر کے ایک اہم رہنما کینیڈا میں خصوصی تقریب میں شرکت کے لیے آئے۔ تو ان سے راقم نے پوچھا کہ جناب حریت کانفرنس کی کیا صورتحال ہے؟ تو موصوف گویا ہوئے۔ الیکشن کا بائیکاٹ کر کے اس لیڈر شپ نے اپنے آپ کو سری نگر تک محدود کر دیا۔ ان کا تعلق وادی کے اندر بھی زیادہ نہیں۔ وہ اس شہر سے آخر پورے کشمیر کے لوگوں کو کس طرح متحد رکھ سکتے ہیں۔ جب جموں اور لداخ کے ساتھ ان کے روابط نہیں رہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ انڈیا کو تقسیم کرو اور حکومت کرو کے سابقہ نوآبادیاتی دور کے پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کا موقع مل گیا۔ لداخ کونسل کو ایک الگ تھلگ پارٹی کی صورت دے دی گئی۔ اور کچھ عرصہ بعد ان کو کشمیر سے الگ کرنے کے لئے تیار کر دیا جائے گا۔ یہ بات موصوف نے ۱۹۹۰ء کے دوراہے میں کہی تھی اور یہ بات ۲۰۱۹ء میں سچ ثابت ہو گئی۔ حریت کانفرنس کے لیڈران گدی نشین بن گئے۔ سید علی شاہ گیلانی خرابی صحت کے باوجود اپنے گروپ کی قیادت کرتے رہے اور متبادل لیڈر شپ کو آگے نہ آنے دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خرابی صحت کی وجہ سے وہ نازک وقت میں کچھ زیادہ پیش رفت نہ کر سکے اور عین اس وقت جب کہ پورا کشمیر قید خانہ بنا دیا گیا تھا۔ موصوف ۵ اگست ۲۰۱۹ء کے بعد مکمل طور پر غیر مؤثر ہو کر رہ گئے اور ان کی صحت اس قدر خراب ہو گئی کہ خاندان کے افراد نے خود ہی ان کو لیڈر شپ سے علیحدہ کرنے کا اعلان کر دیا۔ کیونکہ موصوف آپ ذہنی طور پر کام کرنے کے قابل نہ رہے تھے۔ یہاں تک کہ مقبوضہ کشمیر کی اہم شخصیت کے مطابق وہ جب ان سے آخری بار ملنے گئے۔ تو وہ کسی بھی قسم کی حرکت کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حریت کانفرنس آزمائش کے وقت آگے نہ بڑھ سکی۔ یسین ملک جیل میں ہیں۔ بانی میر واعظ عمر فاروق نے ڈیل کر کے رہائی حاصل کی اور سید علی شاہ گیلانی کو پیرانہ سالی کی وجہ سے خاندان والوں کو اعلان کے ذریعے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس دوران مقبوضہ کشمیر کے انڈین لابی کے لیڈران محض نعرہ بازی کر کے اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے لانے کی کوششیں کرتے رہے۔ تاکہ وقت آنے پر وہ انڈین حکومت کے وفادار چمچے بن کر دوبارہ اقتدار حاصل کرسکیں اس دوران پاکستان کی اکثر حکومتیں بھی اپنی پسند کے حریت لیڈروں کو آگے بڑھنے کے لئے کہتی رہیں اور یوں جو کام انڈیا کشمیری لیڈر شپ کو تقسیم کرنے کے لیے کر رہا تھا۔ پاکستان کے لیڈران بھی اس میں انڈیا کے ساتھ بنے رہے۔ حریت کانفرنس میں مشرف کے دورِ حکومت میں تقسیم کا نیا پودا لگایا گیا۔ راقم کی اطلاعات کے مطابق اس وقت بھارتی حکومت نے امریکہ پر دباؤ ڈالا کہ سید علی شاہ گیلانی کی سرپرستی پاکستان کر رہا ہے اور وہ دہشت گردوں کا سرپرست لیڈر رہے۔ چنانچہ انڈیا نے میر واعظ عمر فاروق کو آگے کیا اور موصوف کو دیارِ غیر کے دوروں میں سرکاری فنڈ سے بھیجا جاتا رہا۔ ۱۹۹۰ء کے دوراہے میں اس قسم کے دوروں میں اکثر انڈین سرپرستی شامل رہی۔ موصوف حریت کانفرنس میں رہنے کے باوجود حکومتی اراکین سے دہلی میں ملاقاتیں کرتے رہے اور یوں حریت کانفرنس کو تقسیم کر دیا گیا۔ جس کے نتیجے میں تحریک آزادی کی واحد سیاسی جماعت عالمی سطح پر اپنی پوزیشن برقرار نہ رکھ سکی اور اس میں دونوں حکومتوں نے اپنا اہم کردار ادا کیا۔ گویا کشمیر کو دونوں ملکوں کا ایک سیاسی کھلونا بنا دیا گیا۔ اس کی واحد مثال وزیر اعظم پاکستان جناب عمران خان صاحب کی حلف برداری کی تقریب تھی۔ یہ ۱۸ اگست ۲۰۱۸ء کو ہوئی۔ جس میں عمران خان نے انڈیا سے تین اہم شخصیات کو دعوت دی۔ نوجوت سنگھ سدھو، سنیل گواسکر اور کپل دیو اور اس سلسلے میں نوجوت سنگھ سدھو کے بارے میں اطلاعات کے مطابق عمران خان کو خصوصی طور پر کہا گیا تھا کہ وہ پنجاب کا وزیر تھا اور پاکستان کے پالیسی ساز ادارے امریکہ اور سعودی عرب کے دباؤ میں تھے اور وہ بھارت کے ساتھ تعلقات بہتر کریں۔ یاد رہے کہ ۲۰۱۸ء میں بھارت کی حکومت نے مقبوضہ کشمیر میں انسانی حقوق کی سنگین ترین خلاف ورزیاں کیں۔ سیز فائر لائن پر بدستور بھارتی خلاف ورزیوں کی وجہ سے کروڑوں کی جائیدادوں کو نقصان پہنچا۔ بے شمار شہری ہلاک و زخمی ہوئے اور ایک طرح سے بھارت نے پاکستان پر دباؤ کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا۔ کیونکہ بھارت ایک فیصلہ کن تیاری میں تھا۔ جس کے تحت مقبوضہ کشمیر کا بٹوارہ کرنے کا منصوبہ جاری کر دیا گیا تھا۔ مگر پاکستان کے حکمران خوابِ خرگوش میں رہے اور نریندر مودی کی حکمت عملی کو نہ جان سکے۔ ایک عرصہ سے پنجاب کے سکھ کرتار پور کوریڈور کو کھولنے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ اسی اجلاس کے دوران نوجوت سنگھ سدھو کی کرسی آزاد کشمیر کے صدر کے ساتھ لگا دی گئی اور اسی اجتماع کے دوران جب جنرل باجوا تشریف لائے۔ تو موصوف نے نوجوت سنگھ سدھو سے ہاتھ ملایا۔ موصوف نے مذاق میں انہیں گلے لگا لیا اور کہا پنجابی گلے لگتے ہیں۔ یعنی جھپی مارتے ہیں۔ اس مذاق، مذاق میں مسٹر سدھو نے کرتار پور کو کھولنے کا مطالبہ کر دیا اور جنرل صاحب نے کہا کہ وہ اس پر غور وخوض کریں گے۔ گویا ایک طرف نرندر مودی صاحب کشمیر پر مکمل حملہ کر چکے تھے۔ تو دوسری طرف ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت پاکستان کو اشارہ دے دیا گیا کہ تلخی کی اس فضاء کو کم کرنے کے لیے ایک نیا راستہ تلاش کریں۔ چنانچہ جب یہ ڈرامہ اسلام آباد میں رچایا جا رہا تھا۔ تو دوسری طرف کشمیر میں خون خرابہ جاری تھا۔ اس سلسلے میں بعد ازاں پتہ چلا کہ یہ کام ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا تھا۔ کیونکہ امریکہ سمیت امریکہ کے اتحادی جس میں سعودی عرب اور خلیج فارس کی ریاستیں بھی تھیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں مختلف ذرائع سے دباؤ ڈالا۔ جن میں سابق آرمی چیف جنرل راحیل شریف بھی شامل تھے۔ چنانچہ بھارت کی زیادتیوں کے خلاف کاروائی کرنے اور بھارت کا مکمل طور پر بائیکاٹ کرنے کی بجائے چند ہی ماہ بعد کرتار پور کے علاقے میں وسیع پیمانے پر آپریشن شروع کیا گیا اور تمام زمین مقامی کسانوں سے لے لیں گیں اور ان کو فی کنال معمولی رقم دینے کا اعلان کیا گیا۔ مگر کسانوں نے یہ سودا قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ مگر ان بیچارے کسانوں کو معاوضہ ادا

کئے بغیر بے دخل کر دیا گیا اور کرتار پور کوریڈور کا تعمیراتی پروگرام شروع کر دیا گیا اور کہا گیا کہ یہ سلسلہ صرف سکھوں کی مذہبی جگہوں پر آنے کے لئے کھول دیا گیا ہے اور بغیر ویزے کے اس علاقے میں بھارتی شہریوں کو آنے کی اجازت دی جائے گی۔ مگر دوسری طرف سے سیز فائر لائنز پر دونوں طرف کی فوجیں ایک دوسرے پر گولہ باری کر رہی تھیں۔ وادی نیلم کے میرے ایک عزیز کے مطابق یہ گولہ باری بھی زیادہ تر عام آبادیوں کو ہی برداشت کرنا پڑ رہی تھی۔ گزشتہ تیس سالوں سے نہ انڈیا نے ایڈوانس کیا نہ پاکستان کی افواج نے آگے بڑھنے کی کوششیں کیں۔ پھر اس قسم کی جھڑپوں کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا اور یہ بات بھی سمجھ میں نہیں آئی کہ ایک طرف ۱۵۰۰ کلومیٹر سے زیادہ علاقے میں دونوں طرف گولہ باری ہو رہی ہے اور یہ کشمیر کے علاقے ہیں۔ مگر دوسری طرف واہگہ بارڈر لائن پر ایک دوسرے کے قومی دن پر سکیورٹی فورسز ایک دوسرے کو مٹھائیاں تحفے میں دے رہی ہے۔ پھر جب ۵ اگست ۲۰۱۹ء کو کشمیر کی خصوصی حیثیت ختم کر کے بھارت نے اسے صوبے کا درجہ دے دیا اور لداخ کو براہِ راست مرکز کے زیر انتظام کر دیا۔ تو پاکستان کے وزیر اعظم آزاد کشمیر کے دورے پر گئے۔ جناب عمران خان کے یہ الفاظ پوری دنیا نے سنے۔ جب موصوف نے انڈیا کے وزیر اعظم مسٹر نریندر مودی کو ہٹلر کا درجہ دے دیا اور سخت ترین الفاظ استعمال کیے اور کہا کہ ہم کشمیریوں کے ساتھ کھڑے ہیں۔ پھر جنرل اسمبلی کے اجلاس میں موصوف نے کشمیر پر سخت ترین اور جذباتی تقریر کی۔ وائٹ ہاؤس میں کشمیر کا ذکر ہوا اور مسئلے کو عالمی پوزیشن ملی۔ مگر واپس جاتے ہی موصوف کے ان الفاظ نے انکے چہرے سے نقاب ہٹا دیا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ یہ ان کے الفاظ تھے کہ انڈیا نے لاک بندی کے دوران ۲۰ ہزار کشمیری شہریوں کو اغوا کر کے غائب کر دیا اور ہزاروں افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ موصوف نے واپسی پر کھلے عام انٹرویو میں کہہ دیا کہ مسئلہ کشمیر کے سلسلے میں ہم کوشش کریں گے۔ مگر یہ بات صاف طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ جو شخص کشمیر جا کر ہتھیار اٹھائے گا۔ وہ کشمیریوں کا دشمن ہوگا اور پاکستان کا غدار ہوگا۔ ذرا دیکھ لیجئے۔ اس پیغام سے تو صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موصوف نے انڈیا کو اشارہ دے دیا کہ تم اپنے کام کرتے رہو۔ ہم تماشائی کا کردار ادا کرتے رہیں گے اور پھر ملیشیا میں اسلامی کانفرنس کے اجتماع کا بائیکاٹ کر اپنے آپ کو پوری دنیا کے سامنے بے نقاب کر دیا۔ جب کہ کشمیر ایک سال سے مکمل قید خانہ بنا ہوا تھا۔ جہاں پاکستان کے پرچم میں وہاں کے شہری اپنے شہید بچوں کو دفن کر رہے تھے۔ مگر پاکستان کے وزیر اعظم اور چیف آف آرمی سٹاف جنرل باجوہ صاحب کرتار پور کوریڈور کھول کر انڈین شہریوں کی خاطر تواضع کر رہے تھے۔ جبکہ دوسری طرف انڈین فوجی جگہ، جگہ آزاد کشمیر کے سکولوں اور گھروں کو نشانہ بنا رہے تھے اور ہزاروں لوگ بے گھر ہو چکے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے اہم پیش رفت اس وقت ہوئی۔ جب چین نے لداخ کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ یاد رہے کہ چین اس سے قبل بھی اکسائی چن کا بیشتر علاقہ انڈیا سے ہتھیا چکا تھا اور پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل ایوب خان بھی گلگت بلتستان کا ایک حصہ چین کے ساتھ ایک معاہدے کے تحت حوالے کر چکے تھے۔ چنانچہ چین نے گلوان وادی کی طرف پیش قدمی کی۔ تو بھارت نے بھی ایڈوانس کر کے دفاع کرنا شروع کر دیا۔ مگر چین اپنی پوزیشن مضبوط کر چکا تھا۔ یاد رہے کہ جنرل ضیاء الحق کے دور میں سیاچین گلیشیئر کا علاقہ بھارت نے قبضہ میں لے لیا تھا۔ جو مکمل طور پر برفانی علاقہ ہے۔ مگر بھارت کی منصوبہ بندی یہ تھی کہ پاکستان کو چین سے کاٹ دیا جائے اور وہ واحد راستہ گلگت و بلتستان پر قبضہ تھا۔ مگر پاک فوج کے جوانوں نے بھارت کو سیاچین کی حدود کے اندر ہی روک لیا اور اس برفانی علاقے میں دونوں افواج ایک دوسرے کے سامنے کھڑی ہیں۔ جہاں سالانہ کروڑوں ڈالر کا نقصان اٹھانے کے ساتھ بھارتی جانی نقصان بھی اٹھا رہے ہیں اور یہ جانی نقصان گولی کی بجائے سخت ترین سردی سے ہو رہا ہے۔ اس دوران پاکستان نے چین بھارت جنگ اور تصادم کے دوران لداخ کی حیثیت اور اسے بھارت میں ضم کرنے کے بارے میں مکمل طور پر خاموشی سے کام لیا اور عالمی سطح پر بھی سفارتکاروں کو خاموش رہنے کا مشورہ دیدیا۔ نیو یارک میں مقیم ایک سفارت کار کے مطابق

۲۹۳ سے ۳۰۲ تک

چین کے ایڈوانس کے دوران اگر پاکستان عالمی سطح پر لداخ کی تنازعہ حیثیت کے بارے میں آواز اٹھاتا اور بھارت کی عالمی قوانین کے خلاف ورزی کو نوٹس میں لاتا۔ تو نہ صرف چین اس سلسلے میں پاکستان کی حمایت کرتا۔ بلکہ عالمی اداروں سے بھی پاکستان کو خاصی پذیرائی ملتی۔ مگر پاکستان نے چین کی لداخ کے معاملے میں بھارت کی غیر قانونی کاروائی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جب ایڈوانس کیا۔ تو پاکستان نے خاموشی اختیار کی اور بھارت پر کسی قسم کی عالمی اداروں کی طرف سے دباؤ ڈالنے کے معاملے میں مکمل خاموشی کی وجہ سے بھارت کو لداخ کو بھارت میں ضم کرنے کے اقدام کو عالمی سطح پر نہ اٹھا کر بھارت کے ہاتھ مضبوط کیے اور اس میں چیف آف آرمی سٹاف اور وزیر اعظم عمران خان نے اہم کردار ادا کیا اور یوں چین نے اپنے اقتصادی روٹ کو محفوظ کرنے کے لئے بھارت کو خاصہ پیچھے دھکیل دیا اور بھارت کے لئے آگے بڑھنا اب اتنا آسان نہیں رہا۔ کیونکہ قراقرم ہائی وے پر چین کی افواج، بھارت کو کافی حد تک پیچھے لے گئیں ہیں اور چینی افواج کا لداخ میں بدستور دباؤ جاری ہے اور لداخ اور سیاچین اب بھارتی حکومت کے اخراجات میں دس گنا اضافہ کا باعث بنیں گے۔ کیونکہ ایک طرف بھارت ہے۔ تو دوسری طرف چینی اور پاکستانی افواج ہیں۔ چنانچہ بھارت کو اب سالانہ کئی بلین ڈالر کے اخراجات کرنے پڑیں گے۔ یہ بھارت کے لیے بھی خاصا نقصان دہ ثابت ہوگا۔ چین ایڈوانس نہ کرتا اگر بھارت لداخ کے معاملے میں براہ راست اقدام نہ کرتا۔

تصویر

تصویر میں دائیں سے مسٹر ٹینیسن بوس، سیکرٹری جنرل ہیومن رائٹس کونسل آف انڈیا۔ ظفر معراج ایڈیٹر کشمیر منیٹر یال۔ سرینگر ڈاکٹر دیا ورما، چیئرمین ساؤتھ ایشین انٹرنیشنل فیڈریشن اور راجہ حبیب جالب چیئرمین جموں اینڈ کشمیر ہیومن رائٹس کونسل انٹرنیشنل ونگ اینڈ ایڈیٹر "اپنا وطن" کینیڈا۔

مگر پاکستان کی خارجہ پالیسی اس دوران بری طرح ناکام رہی اور حکومت کے نمائندے اپوزیشن لیڈران کو جیلوں کے حوالے کرنے اور طرح، طرح کے الزامات لگا کر ملک کے اندر بحران پیدا کرتے رہے اور ان کو پوری معاونت ایجنسیاں کرتی رہیں۔ حالانکہ اس بحرانی دور میں حکومت کو چاہیے تھا کہ وہ اپوزیشن کو ساتھ لے کر چلیں اور سب مل کر مضبوط آواز اٹھائیں اور اپوزیشن کے لیڈران بھی مسئلہ کشمیر پر مضبوط موقوف اٹھائیں۔ مگر دونوں گروپ ایک دوسرے کے خلاف جنگ و جدل میں شامل رہے اور دوسری طرف بھارت اتنے طویل لاک ڈاؤن کے باوجود اپنے مقاصد میں کامیاب رہا اور پاکستان کی حکومت نے ایک نیا شوشا چھوڑ کر کشمیری باشندوں کو ششدد کر دیا۔ جب ایک دن اعلان کیا گیا کہ گلگت و بلتستان کو صوبائی حیثیت دی جائے گی۔ حالانکہ جنوبی پنجاب کی چار کروڑ آبادی والے علاقے کے لوگ

گزشتہ 73 سالوں سے صوبہ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔مگران کو صوبہ نہیں دیا گیااور گلگت و بلتستان کی آبادی تو اس وقت 20 لاکھ کے لگ بھگ ہے۔اتنی چھوٹی آبادی والے علاقے کو صوبائی حیثیت دینے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔اس کے بارے میں نیویارک میں مقیم نامور پاکستانی سفارتکار کھلے عام کہہ چکے ہیں کہ ایسا چین کے دباؤ میں ایسا کیا جارہا ہے۔چین نے پاکستان کو کہا کہ وہ بھارتی اقدامات کے خلاف آواز بلند کریں۔تو پاکستان نے امریکہ اور سعودی عرب کے دباؤ میں آکر خاموشی اختیار کی اور جب چین اور بھارت کے درمیان تصادم ہورہا تھا۔تو لداخ کے معاملے میں آواز اٹھانے کی بجائے آرمی چیف سمیت وزیراعظم خاموش تماشائی بنے رہے۔چنانچہ اب چین نے پاکستان کی کمزور پالیسیوں کی وجہ سے واضح کردیا کہ اتنی بڑی سرمایہ کاری کے بعد پاکستان گلگت و بلتستان کوریڈور کو تحفظ فراہم کرنا ہوگا اور دونوں ملکوں کے دوران پاک فوج کی کثیر تعداد گلگت و بلتستان میں متعین کی گئی ہے۔جس سے واضح اشارہ ملتا ہے کہ پاکستان کی ناکام پالیسی سے چین بھی نالاں ہے اور کشمیر کے بارے میں واضح موقف کے باوجود چین عارضی طور پر اپنے کاروباری لنک کو مضبوط بنانے اور تحفظ دینے کا خواہشمند ہے۔اس لیے اب بھارت کی طرح پاکستان بھی اس علاقے کو صوبائی حیثیت دے کر کشمیر کے کفن میں آخری کیل لگانے کے بارے میں سوچ رہے ہیں۔جس کے خلاف احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔

تصویر

انٹرنیشنل ساؤتھ ایشین کانفرنس کے موقع پر چیئرمین کونسل ڈاکٹر دیا ورما اور راجہ حبیب جالب چیئرمین جموں وکشمیر ہیومن رائٹس کونسل انٹرنیشنل ونگ اختتام کانفرنس کے موقع پر لی گئی تصویر۔

اس سلسلے میں وزیراعظم پاکستان کے بیانات کو عالمی میدان میں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جارہی۔ کیونکہ موصوف نے نازک وقت میں بھارت کے خلاف عالمی سطح پر کردار ادا کرنے کی بجائے امریکہ اور سعودی بلاک کے کہنے پر خاموشی اختیار کی اور متحدہ عرب امارات کی طرف سے مودی کو اہم ترین دوست کا ایوارڈ اس وقت دیا گیا۔جب دنیا بھر میں بھارت میں مسلمانوں پر ہونے والے ظلم اور زیادتی اور کشمیر میں مکمل لاک ڈاؤن پر احتجاج کیا جارہا تھا۔اس اقدام کے باوجود پاکستان نے متحدہ عرب امارات کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔حالانکہ متحدہ عرب امارات کوئی ریاست نہیں۔یہ ایک عالمی بینکوں اور حکومتوں کے لیے منی لانڈرنگ کا ایک مرکز ہے اور اس مرکز میں پاکستان کے تمام حکمرانوں کا سرمایہ شامل ہے۔ جن میں عمران خان کی بہن شامل ہیں۔ایسے حالات میں کشمیر کا یہ بحران مزید پیچیدہ ہوتا جارہا ہے۔جس میں چین نے بھی اپنا حصہ وصول کرنے کا پروگرام بنایا ہے اور امریکہ اور مغربی ملکوں کی طرف سے بھارت کو تھپکی دی جارہی ہے کہ وہ چین کو مکمل طور پر بلاک کرنے کی کوشش کرے اور ہمارے حکمران اس حساس صورت حال سے گزرتے ہوئے بھی آنکھیں بند کر کے دو کشتیوں میں سوار ہیں اور دونوں طرف سے امیدیں لگائے بیٹھے ہیں۔

تصویر

(تصویر اسلامک سنٹر میں کشمیر پر ایک سیمینار میں مختلف ملکوں کے مندوبین کے ساتھ کونسل جنرل آف پاکستان چوہدری محمد اشرف صاحب اور راقم کے علاوہ دوسرے صاحبان سیمینار کے اختتام پر کھڑے ہیں۔یہ پروگرام کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کی رپورٹ پر مختلف ماہرین کی آراء پر مشتمل تھا۔جس میں راقم کی رپورٹ بھی شامل تھی۔جس میں سیز فائر لائن اور مقبوضہ کشمیر میں بھارتی افواج کی زیادتیوں کی تفصیلات بھی شامل تھیں)۔

عالمی معاملات میں اسلامی دنیا میں صرف دو ممالک ایسے تھے۔جنہوں نے اس بحران کے دوران کشمیری مسلمانوں اور ریاست جموں وکشمیر کی وحدت کے بارے میں کھل کر اظہار خیال کیا۔ان میں ترکی کے صدر طیب اردگان اور ملائیشیا کے وزیراعظم شامل تھے۔جنہوں نے ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں مسلسل بھارت کے خلاف زبردست آواز اٹھائی اور بھارتی دباؤ کے باوجود ترکی اور ملائیشیا نے پاکستان سے بھی آگے بڑھ کر سخت ترین ردعمل کا اظہار کیا اور واضح کیا کہ ریاست جموں وکشمیر میں وحدت میں کسی بھی قسم کی تبدیلی اقوام متحدہ کی قراردادوں کی سنگین خلاف ورزی ہے اور ان دونوں ملکوں نے سعودی عرب اور خلیج کی ریاستوں کی پالیسیوں کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا اور ان کی اس شدید تنقید کے بعد خلیج کی ریاستوں اور سعودی عرب کے اندر بھی ان ملکوں کے لیڈران کے کردار پر آواز اٹھائی گئی اور اسلامی دنیا میں سعودی حکمرانوں اور خلیج کی ریاستوں کو مودی کا ایجنٹ قرار دیا گیا۔یہاں تک دیار غیر میں مقیم سعودی پناہ گزینوں اور شہریوں نے بھی کھلے عام سعودی اقدامات کی مذمت کی اور اسے ایک انتہائی غلط اقدام قرار دیا گیا۔

تصویر

1996ء کے دوران ہیومن رائٹس کے ساتھ منسلک ڈاکٹر مطلوب حسین مرحوم درمیان میں، بائیں بشیر حسین خان ساؤتھ ایشین کمیونٹی لیڈر اور دائیں راجہ حبیب جالب چیئرمین ہیومن رائٹس کونسل پارلیمنٹ ممبران کو خطوط دینے کے بعد آٹاوا میں۔

۲۰۱۹ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک آزاد کشمیر کے سیاسی لیڈران کا کردار سیر سپاٹے کے علاوہ کچھ نہیں۔ ۲۰۱۹ء اور ۲۰۲۰ء میں آزاد کشمیر کے وزیراعظم راجہ فاروق حیدر صاحب نے عملی طور پر اپنی بساط کے مطابق پاکستان کے لیڈران کرام اور سیاستدانوں کو کشمیر کے بحران پر توجہ دینے کے لیے خاصی اپیلیں کیں۔دیار غیر کے سفر بھی کیے اور مرکزی حکومت نے ان کے سخت بیانات پر ان کو وارننگ بھی دی۔مگر موصوف نے اس سلسلے میں اپنی حدود میں رہ کر خاصی سرگرمی دکھائی۔دیگر لیڈران جماعت اسلامی آزاد کشمیر کے سابق امیر اور ممبر اسمبلی آزاد کشمیر کا کردار بھی اچھا رہا۔انہوں نے اس سلسلے میں ہر سطح پر آواز بلند کی۔مگر باقی لیڈران جو قومی خزانے سے گزشتہ بیس سالوں سے کروڑوں کی رقوم موصول کرتے رہے۔خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتے رہے اور متحد ہو کر آواز بلند کرنے میں ناکام رہے۔کرونا وائرس کی وجہ سے فضائی پابندیوں کی وجہ سے ان لیڈران کو خاصا نقصان ہوا کہ وہ زیادہ دورے نہیں کر سکے۔مگر فیس بک اور زوم کے ذریعے ان کی کشمیر کے نام پر تجارت کا سلسلہ جاری رہا۔ان لیڈران کی بھی اپنی مجبوریاں ہیں۔بغاوت کریں گے اور سچ بات کریں گے۔تو غدار کہلائیں گے۔جس طرح آزاد کشمیر کے وزیراعظم راجہ فاروق حیدر خان کے خلاف مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں شرکت اور خطاب پر غداری کے الزامات میں مقدمہ درج کروائے گئے۔افسوسناک بات یہ ہے کشمیر میں بربریت کا بازار گرم ہے اور پاکستان میں وہی پرانی گندی سیاست کا راج جاری ہے۔اللہ پاک سے مدد کی درخواست ہی کی جاسکتی ہے۔اب کسی

سے امید نہیں ہے کہ بھارت کی طرف سے آنے والی اس عصبیت کی وباء کو روک سکے اور کوششوں کے باوجود نہ پاکستان کے جنرل حضرات کو ہوش آیا ہے نہ ہی سیاستدانوں کے ذہن سے گندگی دور ہوتی نظر آتی ہے۔نتیجہ کشمیری مایوسی کے عالم میں اپنی بساط کے مطابق جدوجہد جاری رکھے ہوئے ہیں۔شاید اس طرح صدی گزر جائے مگر امید پر دنیا قائم ہے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ ایک دن ہم ضرور آزادی حاصل کریں گے۔

314

تصویر

۱۹۹۰ء کے دوران پاکستان کے دوران کشمیر ہاؤس اسلام آباد میں آزاد کشمیر کے صدر سکندر حیات صاحب کی دعوت پر شریک ہوا۔مسئلہ کشمیر سمیت دیگر امور پر تفصیلی بات چیت ہوئی۔میں کشمیر کے پونچھ کے حصے پر کتاب مرتب کرنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔موصوف نے میری اس سلسلے میں خاصی مدد کی اور غازی کشمیر سردار فتح محمد کریلوی مرحوم کے بعض خطوط فراہم کیے۔تصویر میں دائیں راقم، سردار سکندر حیات صاحب صدر آزاد کشمیر، کرنل (ریٹائرڈ) راجہ محمد نسیم خان مرحوم اور دیگر افراد۔

شام دی لیزے پیرس

۱۹۸۸ء کو مجھے پیرس میں آگنائزیشن آف ساؤتھ ایشین کی دعوت پر جانے کا موقع ملا۔میں پاکستان کا پروگرام بنا رہا تھا۔مگر مجھے مسلسل فون آتے رہے کہ آپ وزٹ کریں۔چنانچہ میں چند دن کے لیے پاکستان جاتے ہوئے پیرس رک گیا۔وہاں میری ملاقات مقبوضہ کشمیر کے ایک کشمیری پنڈت ایس۔آر۔ کھپرو نامی شخص سے ہوئی۔جو ایک عرصے سے پیرس میں رہتے تھے اور وہاں ڈاکٹر تھے۔موصوف مجھے اپنے گھر لے گئے۔میری خوب تواضع کی۔انتہائی نفیس انسان تھے۔مقامی فرانسیسی خاتون سے شادی کی ہوئی تھی۔وہ بھی اس کانفرنس میں مندوبین میں شامل تھی۔کہنے لگے راجہ صاحب کشمیر کی اصلی وارث تو ہم تھے۔مگر آج ہماری کوئی پوزیشن نہیں رہی۔ہم کشمیر کی حیثیت کی بحالی کے خواہشمند ہیں۔مگر کشمیر خود مختار ہوتا ہے۔تو ہمارا تحفظ کون کرے گا۔پاکستان میں شامل ہوتا ہے۔تو پھر ہمارا کیا ہوگا اور اگر ہندوستان میں شامل ہوتا ہے۔تو مسلمانوں کا کیا ہوگا۔میرے خیال میں اس مسئلے کا واحد حل یہ ہے۔اس ریاست کو آزاد اور خود مختار ریاست رہنے دیا جائے اور کشمیر کو سویزرلینڈ کی طرح ایک غیر جانبدار ملک بنا دیا جائے۔جس میں انڈیا اور پاکستان دونوں کو کاروبار اور سیاحوں کو کھلے عام آنے جانے کی سہولت ہو۔دونوں کے ساتھ بہتر تعلقات رکھیں اور پاک بھارت دونوں اس ملک میں کسی قسم کی مداخلت نہ کریں اور اس کے آئین میں تمام مذاہب کو مذہبی آزادی اور تحفظ حاصل ہو تاکہ 1947ء کی طرح قتل عام نہ ہو اور صدیوں سے یہاں مقیم لوگوں کو بھاگنا نہ پڑے۔مجھے درجن بھر مختلف گروپوں کے لوگوں سے ملاقات کا موقع بھی ملا۔جن میں جموں کے ایک ڈوگرہ خاندان کے فرد انجینئر مان سنگھ بھی تھے۔جن کا تعلق جموں سے تھا۔وہ لوگ بھارتی حکومت سے اس قدر خائف تھے۔جب تصاویر لینے کے لئے ایک پاکستانی مندوب نے کہا۔تو دونوں حضرات نے معذرت کر دی۔کہنے لگے ہم کشمیر جاتے رہتے ہیں۔یہ تصاویر میڈیا میں چلی جائیں۔تو ہم مصیبت میں پڑ جائیں گے۔لیکن مجھے خوشی ہوئی کہ ان میں وطن کے ساتھ پیار و محبت کی روایت ہے اور مجھ سے انتہائی شفقت سے پیش آئے اور تحفے دے کر رخصت کیا۔

317

تصویر

پیرس ۱۹۸۸ء دریا کے نزدیک ایفل ٹاور کا خوبصورت منظر۔پیرس کا شہر واقعی انتہائی خوبصورت اور پرانی تاریخی عمارتوں اور خوبصورت چرچ اور عبادت گاہوں کی وجہ سے بہت مشہور ہے۔

راجہ محمد حبیب جالب

چیئرمین جموں اینڈ کشمیر ہیومین رائٹس کونسل انٹرنیشنل ونگ
صدر: انسانی حقوق ونگ کشمیر سولیڈریٹی، کونسل، نارتھ امریکہ

ڈاکٹر ایوب ٹھاکر اور راجہ حبیب جالب برمنگھم کے الحجرہ سکول میں کشمیر کانفرنس کے موقع پر

مہاراجہ ریسٹورنٹ میں ظفر معراج کے اعزاز میں استقبالیہ میں:
(دائیں سے بائیں) ڈاکٹر مطلوب حسین، ظفر معراج، راجہ حبیب جالب، بشیر حسین اور پروفیسر پرویز حیات

مانٹریال میں کشمیر پر ہونیوالی ایک کانفرنس
(دائیں سے بائیں) ٹپن بوس، سیکریٹری جنرل ہیومن رائٹس کونسل، انڈیا، ظفر معراج، ایڈیٹر ''کشمیر مانیٹر'' سرینگر، ڈاکٹر دیا ورما، چیئرمین، ساؤتھ ایشین انٹرنیشنل فیڈریشن اور راجہ حبیب جالب چیئرمین ہیومن رائٹس کونسل وایڈیٹر ''اپنا وطن''

مانٹریال، کینیڈا میں ۲۰ جولائی ۲۰۰۰، سیمینار کے موقع پر دائیں سے دوسرے: نوشاد صدیقی، پاکستان انڈیا پیس مشن کے چیئرمین ٹپن بوس، راجہ حبیب جالب